مقالہ برائے ایم ایس اردو

فاطمہ حسن کی نثری تحریروں میں عصری شعور

مقالہ نگار: فاطمۃ الزہرہ

رجسٹریشن نمبر: 250/FLL/MSURDU/F20

نگران: ڈاکٹر سائرہ بتول

انچارج شعبۂ اردو

CENTRAL
LIBRARY
ISLAMABAD

شعبۂ اردو

کلیہ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

K
Accession No TH_27372

MS
891.4391
ف اف

حوالہ جاتی مطالعہ
اُردو ادب . اُردو نثر
فاطمہ حسن کی نثری تحریروں میں عصری شعور

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **FATIMA TU ZUHRA**

Title of the Thesis: فاطمہ حسن کی نثری تحریروں میں عصری شعور

Registration No: **250-FLL/MSURD/F20**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Kamran Abbas Kazmi
Chairperson
Department of Urdu
Islamabad

External Examiner:

Dr. Shehnaz Parveen
Assistant Professor
Margalla College, F-7/4,
Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Shiraz Fazal Dad
Assistant Professor
Department of Urdu, IIUI,
Islamabad

Supervisor:

Dr. Saira Batool
Assistant Professor
Department of Urdu, IIUI
Islamabad

C544047.

100 Rupees

۱۰۰ روپیہ

بیان حلفی

مسماۃ فاطمۃ الزہرہ دختر امتیاز احمد، رجسٹریشن نمبر 250-FLL/MSURDU/F20 ساکن ڈاکخانہ صوابی محلہ تورڈھیر صوابی۔

یہ اقرار کرتی ہوں کہ میں نے اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان فاطمہ حسن کی نثری تحریروں میں عصری شعور برائے حصول ایم ایس ڈاکٹر سائرہ بتول کی زیرنگرانی اپنی محنت سے تحریر کیا ہے۔

یہ کہ مقالہ سرقے سے پاک ہے اور اس میں تحقیق اور تنقید کے اُصول وضوابط کو مدنظر رکھا گیا ہے نیز اس پہلے یہ کسی جامعہ میں برائے حصول سند پیش نہیں کیا گیا ہے اس میں شامل تمام حوالہ جات کا استناد موجود ہے اور میں مقالے کے تمام نتائج تحقیق کی ذمہ دار ہوں۔

بیان مندرجہ بالا میرے علم اور یقین کے حد تک صحیح اور درست ہے اور اس میں کوئی امر مخفی یا پوشیدہ نہ رکھا گیا ہے۔

المرقوم 06-06-2023

الحلف

فاطمۃ الزہرہ دختر امتیاز احمد

16202-9624690-8

گواہان

1. امتیاز احمد

2. نثار محمد خان

CENTRAL LIBRARY ISLAMABAD

ATTESTED IQBAL MAHER

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اردو (خواتین)

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ فاطمۃ الزہرہ رجسٹریشن نمبر: 250/FLL/MSURDU/F20 نے ایم۔ایس اردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان "فاطمہ حسن کی نثری تحریروں میں عصری شعور" میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران

ڈاکٹر سائرہ بتول

انچارج شعبۂ اردو

فہرست ابواب

پیش لفظ ۳

باب اول: عصری شعور: بنیادی مباحث ۴

باب دوم: فاطمہ حسن کی تحریروں میں سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر رد عمل کا اظہار ۴۷

باب سوم: فاطمہ حسن کی تحریروں میں خواتین (بطور صنف اور انفرادی فرد) کے کردار کی پیش کش ۷۷

باب چہارم: فاطمہ حسن کی نثری تحریروں میں معاصر صورت حال کی عکاسی ۱۱۰

ماحصل ۱۳۸

کتابیات ۱۵۱

پیش لفظ

الحمد للہ رب اللعالمین میرا تھیسز پایہ تکمیل کو پہنچا۔ فاطمہ حسن عصر حاضر کی بڑی شاعرہ ہیں ان کے ہاں معاشرے کے سلگتے موضوعات ملتے ہیں اسی وجہ سے ان کی شاعری پر کئی مقالے مقالے ملتے ہیں مگر ان کی نثر پر خال خال کام ملتا ہے۔ اس لیے میں نے ان کی نثر پر کام کا ارادہ کیا اور اپنی نگران ڈاکٹر سائرہ بتول سے مدد کی درخواست کی تو انھوں نے مجھے ان کی تحریروں میں عصری شعور پر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ پھر یہی میرا موضوع بن گیا۔ اس مقالے کو میں نے پانچ ابواب میں منقسم کیا ہے۔ باب اول: عصری شعور: بنیادی مباحث، باب دوم: فاطمہ حسن کی تحریروں میں سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر ردعمل کا اظہار، باب سوم: فاطمہ حسن کی تحریروں میں خواتین (بطور صنف اور انفرادی فرد) کے کردار کی پیش کش، باب چہارم: فاطمہ حسن کی نثری تحریردں میں معاصر صورت حال کی عکاسی اور آخر میں ماحصل میں نتائج پیش کیے گئے ہیں۔

میں اپنے اس کام کے لیے سب سے پہلے تو اپنے رب کی شکر گزار ہوں جس نے مجھے اتنا حوصلہ دیا کہ میں یہ مقالہ لکھ سکوں اس کے بعد اپنے اساتذہ بالخصوص ڈاکٹر سائرہ بتول کی ممنون ہوں کہ انھوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور پھر اپنے گھر والوں کا شکریہ ادا کروں گی کہ انھوں نے مالی واخلاقی ہر طرح کی امداد سے میرا حوصلہ بڑھایا۔

فاطمۃ الزہرا

باب اول

عصری شعور: بنیادی مباحث

باب اول

عصری شعور: بنیادی مباحث

عصری شعور:

عصر سے مراد ہے زمانہ۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی، زمانہ، وقت اور روزگار کے ہیں۔(۱)(بحوالہ ریختہ) عصر کے ساتھ یاے نسبتی لگا دیا جائے تو عصری بن جاتا ہے جس کا وسیع مفہوم "زمانے یا عہد کا" بن جاتا ہے۔ انگریزی میں عصر کے لیے Time یا Age کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے ایک ہی زمانے یا عہد سے تعلق رکھنے والوں کے لیے "ہم عصر کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ عصر سے عصریت (اسم صفت) کا لفظ بنتا ہے جس کے لیے انگریزی میں Contemporary کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ دی اوکسفرڈ ڈکشنری میں Contemporary کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے۔

Belonging to the same time, age, or period, living

Existing or occurring together intime. (۲)

عصری یا Contemporary کے معنی تمام انگریزی لغات میں کم و بیش ایک جیسا معنی دیا گیا ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں عصر کے لغوی معنی ہیں۔

۱۔ روزگار۔ زمانہ۔ وقت

۲۔ دن کا اخیر حصہ۔ نماز عصر اسی وجہ سے نام رکھا گیا ہے۔(۳)

اردو لغات بشمول قومی اردو لغت بورڈ کی لغت اور ریختہ لغت کے عصر کے عمومی معنی دن کا آخری پہر، تیسرا حصہ، سہ پہر کو ظہر کے بعد اگلی نماز، زمانہ یا عہد کے ہیں عصر کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ حال کو ماضی کے ساتھ مربوط

کر کے مستقبل کے وسوسوں، امیدوں، اور اندیشوں کے شعوری احساس کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ یہی سے عصری شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ شعور بھی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ریختہ ڈکشنری میں یوں دیے گئے ہیں۔

۱۔ کسی کام کو انجام دینے کا سلیقہ، تمیز؛ کسی کام کا ملکہ

۲۔ ہوشیاری، سمجھ بوجھ، احساس، دانائی

۳۔ پہچان، آگاہی، پہچاننا ہر چیز کا، عقل، جاننا؛ علم حاصل کرنا

۴۔ عمر کی وہ ابتدائی منزل جب انسان میں سمجھ اور احساس بیدار ہو یا شروع ہوا ہو، بلوغ

۵۔ (تصوّف) ذات و صفات الہیٰ سے واقف ہونا جو محمود ہے اور غیریت کا شعور مذموم ہے

۶۔ (نفسیات) نفس کی وسیع ترین کیفیت جس کے ماتحت تمام کیفیاتِ نفسی و قوف احساس ارادہ ہیں۔ (۴)

انگریزی میں عصر کے لیے Contemporary اور شعور کے لیے consciousness کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ عصری شعور اپنے زمانے کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی حالات کا شعور رکھنے اور عہد حاضر کی مسلسل وقوع پذیر ہونے والی کیفیات کا ادراک رکھنا عصری شعور کہلاتا ہے۔ تغیر و تبدل ہر عہد کا خاصا ہے۔ انسان معاشرتی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ ہر نیا عہد انسانی زندگی کو مختلف سطحوں پر متاثر کرتا ہے۔ جوں جوں زمانہ ارتقا کرتا ہے توں توں انسانی زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہوتا ہے۔ انور سدید لکھتے ہیں۔

عصری آگہی سے مراد کسی مخصوص معاشرتی، تہذیبی، علمی اور فکری سطح پر رونما ہونے والے واقعات، افکار، اذکار، انکشافات، آگاہی ہے۔ (۵)

عصری شعور ادب میں بھی نظر آتا ہے۔ ادب کی تمام اصناف میں لکھاری کا عصری شعور جھلکتا ہے۔ کوئی تحریر نہ تو کسی ادیب کی ماحولیاتی فضا کے اثر سے باہر رہ کر لکھی جاتی ہے اور نہ ہی زمانے کے ارتقائی اثرات سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ ادب میں ادیب کے داخلی احساسات بھی خارجی ماحول کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔ فکری بوقلمونی اور خیالات کی نیرنگی میں عصری شعور ہی کارفرما ہوتا ہے۔ عصری حسیت، عصری آگہی اور عصری شعور... یہ سب الفاظ کسی مخصوص

عہد کے اجتماعی شعور کے متنوع رجحانات کے آئینہ دار ہوتے ہیں، جن کے ذریعے روحِ عصر اپنا اظہار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ عصری شعور روایت سے انحراف کرنے کی بجائے روایت کے زندہ اور تازہ عناصر کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ عصری شعور ادب کی سمت متعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ادب کا اپنے عہد سے انسلاک، زندگی کے حقائق و معیارات کو پرکھنے اور تازہ فکرہ رویوں سے ہم آہنگ کرنا عصری شعور کہلاتا ہے۔ ڈاکٹر کامران کاظمی لکھتے ہیں۔

عصری شعور دراصل ایسا وقوف ہے جو سماج کے تاریخی عمل، سیاسی پس منظر و پیش

منظر، تہذیبی و تمدنی آگاہی، سماجی ارتقا کی سائنس سے مطابقت اور سماج کے نظام

اقدار سے آگہی کے سبب پیدا ہوتا ہے۔(۶)

شعور یا آگہی کے لیے حسیت کا ہونا ضروری ہے۔ عصری حسیت، عصری شعور یا عصری آگہی کا بنیادی تقاضا یہی ہے کہ کوئی موضوع بار بار دہرایا جائے۔ کسی موضوع کی تکرار کا عمل معاشرتی سطح پر ذہن نشینی کا عمل، یا INDOCRINATION کا عمل ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی مخصوص صورتِ حال میں شعرا و ادبا کے لیے کوئی موضوع توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ شعور مختلف دائروں میں موجود ہوتا ہے۔ ادب کا تعلق کسی خاص فکر و فلسفے سے نہیں ہوتا ہے۔ ادب کا تعلق معاشرے کے ہر پہلو سے ہوتا ہے۔ عصری شعور کا سب سے زیادہ اظہار ادب میں ہوتا ہے۔ ادب ہر عہد میں سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشی حقائق کا ترجمان رہا ہے۔ ادب معاشرے کے تمام داخلی و خارجی پہلوؤں کی متنوع جہات کو مد نظر رکھتا ہے۔ ان کی گہرائی میں اتر کر تمام حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ ادب کے ذریعے ہی ایک نسل کے تجربات دوسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں۔ ادب اپنے عصر کی زبان بن جاتا ہے اور اپنے عہد کی نمائندگی کرتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

عصری آگہی کے بغیر بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا ہے۔
اپنے زمانے اور اس کے شعور ہی سے اس کی روح بیدار ہوتی
ہے۔ لیکن یہ روح زندگی کی یک رخی ترجمانی نہیں کرتی
ہے بلکہ اس لاتعداد رخوں کو سمیٹ کر اسے کچھ
اور بنا دیتی ہے اس لیے ادب کی آواز ایک طرف اپنے
دور کی، دوسری طرف آنے والے دور کی آواز بن جاتی ہے۔(۷)

ادیب کا عصری شعور عام عوام کے عصری شعور سے گہرا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ معاشرے کے ان پہلوؤں کو بھی سامنے لے آتا ہے جو تمام افراد کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے وقت یا عصر ایک نامیاتی کل ہے اس میں صرف حال نہیں موجود ہوتا بلکہ اس میں ماضی اور مستقبل بھی شامل ہوتا ہے۔ فضیل جعفری لکھتے ہیں۔

جو لوگ عصری مسائل کو روحانی اور جمالیاتی تجربات میں بدل دینے پر قادر ہوتے ہیں ان کے یہاں حقیقی عصریت کا عنصر خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔(۸)

اس طرح ایک عام آدی مادی ضرورت کے تحت عصری شعور رکھتا ہے۔ جب کہ ادیب کے ہاں عصری شعور تاریخ کا حصہ بن کر آنے والے وقتوں کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے۔ زمانہ تسلسل کا نام ہے اس میں ہر آنے والا لمحہ اپنے پچھلے لمحے سے مربوط ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف اور منفرد بھی ہے اور یہی انفرادیت اس کا اختصاص ہے جو اس کی شناخت قائم کرتا ہے۔ ہر دور کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اس کے اپنے تقاضے، مسائل، رجحان، سیاست، معاشرت اور تہذیب و ثقافت مختلف ہوتے ہیں۔ ان سب پہلوؤں کے فکری احساسات کو اس عہد کا عصری شعور کہا جاتا ہے۔

کسی دور کے عصری شعور کو متشکل کرنے میں بہت سے امور کار فرما ہوتے ہیں جو اس دور کو دوسروں سے مختلف بناتے ہیں۔ پروفیسر لطف الرحمٰن لکھتے ہیں۔

ہر عہد کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، اپنا رحجان و میلان، اپنا مزاج
و کردار ہوتا ہے اپنی خصوصتیں اور قدریں ہوتی ہیں۔ جن کے تحت
اس عہد کا احساس ابھرتا ہے جس کو مجموعی طور پر عصری حسیت کہتے ہیں۔(۹)

عصری شعور کا نظریہ:

ولیم اروِن تھامپسن (William Irwin Thompson) نے اپنے ایک تحقیقی مضمون contemporary Beyond consciousness میں عصری شعور کے نظریے پر کھل کر بات کی ہے۔ تھامپسن کا یہ مقالہ ۱۱ مئی ۱۹۷۱ء کو شائع ہوا(۱۰) اور ایک نظریے کے طور پر مقبول ہوا۔ تھامپسن نے اس مقالے میں عصری شعور کے مختلف

پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا۔ وہ کہتا ہے کہ لاشعور ذاتی نہیں ہے۔ اور ثقافت صرف سماج کے ساتھ نہیں چلتی بلکہ لوگوں کے رویے سماج کو برتر کرتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو عصری شعور رکھتے ہیں وہ سماج کو بہتر بنانے میں اپنا کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ انسان کا شعور انفرادیت سے اجتماعیت کی جانب سفر کرتا ہے اور اس دوران اس شعور میں تمام کائناتی اسرار و رموز شامل ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے عصری شعور کے نظریہ کی بابت درج ذیل نکات کو بنیاد بنایا ہے۔

۱۔ سماجی و معاشی مسائل کو سامنے لانا۔

۲۔ سیاسی صورت حال پر ردعمل

۳۔ خواتین کا معاشرتی کردار

۴۔ زبان و ادب کی معاصر صورت حال کو سامنے لانا

اگرچہ اس نے ان نکات کو مغربی تناظر میں بیان کیا ہے اور کم و بیش یہی صورت حال بیان کی ہے جو ہمارے عصری عہد کی ہے اس لیے ہم ان نکات کی تشریح اپنے زمان و مکان اور سیاق کے مطابق مفصل کرتے ہیں۔

۱۔ سماجی و معاشی مسائل کو سامنے لانا

سماج انسانوں کے گروہ یا مجموعہ کا دوسرا نام ہے جہاں انسان اپنی پیدائش سے لے کر موت تک کا سفر طے کرتا ہے۔ یہ گروہ مختلف جگہوں اور علاقوں میں آباد ہوتے ہیں ترقی پذیر جگہ شہری سماج جب کہ ارتقا کی دھیمی رفتار والی جگہ کو دیہی سماج کہا جاتا ہے۔ دونوں طرح کے سماج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دیہی سماج میں بدلاؤ کے ساتھ ساتھ شہری سماج بھی کئی طرح کے مسائل سے دوچار ہے مثلاً یہاں فلیٹ کی تہذیب بن چکی ہے، تنہائی، اداسی، بے حسی، رشتوں میں دراڑ، صنعتی تہذیب، مشترکہ خاندان میں بکھراؤ، بے روزگاری، کثرت چہرگی، وحشت و بے چینی، انسانیت کا فقدان، درندگی اور بربریت میں اضافہ، بے امانی، تہذیبی تنزلی، اہل علم و ہنر کی ناقدری، انصاف کا گرتا معیار، پسماندہ سماج، انسانوں کے جنسی و نفسیاتی مسائل، گلوبل وارمنگ، قدرتی آفات، سائنسی ایجادات کے اثرات وغیرہ کو سماجی مسائل کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

آج کے جدید معاشرے میں سماجی، سیاسی اور فکری سطح پر بہت نمایاں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ رہن سہن کے طریقے بدل رہے ہیں۔ انسان فطری سطح پر تغیر و تبدل کے عمل سے گزر رہا ہے۔ جدید دور کے انسان کو بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے تگ و دو کرنا پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر کے انسان کے مسائل بھی دوگنے ہیں۔ ایک عصری شعور رکھنے والا ادیب ان مسائل کی عکاسی بہتر انداز میں کر سکتا ہے۔ وہ لوگوں کے اندر سماجی سطح پر یہ شعور پیدا کر سکتا ہے کہ وہ دوسروں کا خیال رکھیں کیونکہ ہمارے ہاں معاشرے میں بہت سے لوگ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی زندگی کی عکاسی ایک عصری شعور رکھنے والا ادیب ہی کر سکتا ہے۔

آج کے سماج میں اخلاقیات کا تصور بدل گیا ہے۔ ریاکاری ہر شخص کا چلن بن گئی ہے۔ معاشرہ مادیت پسند ہو گیا ہے۔ انسانیت کے بجائے پیسے کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ انسان کی خواہشات نے اسے اس حد تک مصروف کر دیا ہے کہ اس کو معلوم ہی نہیں کہ یہ لاحاصلی کا شکار بن رہا ہے۔ بے اطمینانی آج کے انسان کی بنیادی خصلت بن گئی ہے۔ مادی ہوس نے انسان کو خاندانی نظام، محبت، ہمدردی اور تعلق سے محروم سے کر دیا ہے۔ جدید سماج نے جہاں انسان کی سوچ اور فکر کو بدلا ہے وہیں انسان کے باقی معاملات کو بھی متاثر کیا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے انسانی زندگی کو ترقی یافتہ دور میں شامل کر دیا ہے مگر جدید عہد نے موجودہ انسان کو کئی دوسرے مسائل سے دوچار کیا ہے جن میں سرفہرست نوجوان نسل کا انٹرنیٹ کا بے دریغ استعمال ہے۔ سماج تغیر پذیری کے عمل سے ہمیشہ گزرتا رہتا ہے یہی وجہ کہ ایک ادیب سماج کے مسائل کو ہمیشہ سے موضوع بناتا ہے۔

۲۔ سیاسی صورت حال پر ردعمل:

عصری شعور رکھنے والا ادیب سیاست سے دور نہیں رہ سکتا وہ سیاست پر اپنے خیالات کو اپنی تحریروں کا حصہ بناتا ہے۔ موجودہ دور کی سیاست نہایت آلودہ ہو چکی ہے۔ ایسے ایسے لوگ صاحب مسند ہیں جو سماج میں قابل نفریں ہیں۔ آج کی سیاست کا یہ حال ہے کہ منصب اقتدار پر بیٹھے ہوئے اشخاص پر کئی کئی مقدمے چل رہے ہیں۔ خاص طور پر کرپشن کے مقدمات، کسی پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے تو کسی پر دنگا فساد برپا کرنے کا، کسی پر زمین ہڑپنے کا، اور کسی پر لوگوں کو ڈرانے دھمکانے اور مارنے کا مقدمہ چل رہا ہے۔ جب اس طرح کے لوگ ملک کی باگ ڈور سنبھالیں گے تو

ملک کا مستقبل کیا ہو گا اس کا اندازہان سیاست دانوں کی حرکتوں سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ سیاست کے سبب خانگی اور خارجی دونوں طرح کی زندگیاں متاثر ہوتی ہیں۔ سیاست داں شعلہ بیانی سے لوگوں میں نفرت کے بیج بوتے ہیں جس کا انجام عوام کو بھگتنا پڑتا ہے۔

عصری شعور کے تحت ادیب سیاست کی ہر طرح کی پیچ وخم کو اپنے ادب کا حصہ بناتا ہے۔ ادیب بتاتا ہے کہ سیاست دانوں کو جس امید پہ منتخب کیا جاتا ہے یہ اس کو پورا نہیں کرتے۔ یہ جس علاقے سے منتخب ہو کر جاتے ہیں وہاں دوبارہ لوٹ کر نہیں آتے اور نہ ہی انھیں اپنا کیا ہوا وعدہ یاد رہتا ہے۔

ادیب اپنی تحریروں میں سیاست کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سیاست دانوں کو غریبوں، مظلوموں، مفلسوں، پریشان حالوں اور بھوکوں کا درد محسوس نہیں ہوتا۔ کیوں کہ انھیں ہر طرح کی سہولیات مہیا ہوتی ہیں اور آرام و آسائش اور راحت و سکون کی تمام چیزیں ہر وقت ان کے ساتھ ہیں۔ انھیں غریبوں کا دکھ کیسے محسوس ہو سکتا ہے۔

۳۔ خواتین کا معاشرتی کردار

ایک عصری شعور رکھنے والا ادیب عورت کے حوالے اس کے معاشرتی و سماجی کردار کو متعین کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سماج انسانی کی بنیادی روح عورت ہے اس لیے کہ انسانی ارتقا میں خاندان بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ عورت نہ صرف انسان کو جنم دینے کا وسیلہ بنتی ہے بلکہ وہ خاندان کو قبیلے اور نسل میں بدل دیتی ہے۔ لیکن عصر حاضر میں بھی عورت کو وہ مقام نہیں مل رہا جس کی وہ حق دار ہے عورت کا استحصال آج بھی جاری ہے عورت کے وجود کی نفی کرکے اس کی عزت نفس کو کئی حوالوں سے مجروح کیا جاتا ہے۔ عورت مرد زیر سایہ اور اس کے تسلط میں رہتی ہے۔ حالانکہ عورت خاندان کی سماجی و معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کی خاطر اپنی ذات سے لاپرواہ ہو جاتی ہے۔

ہر معاشرے کی ترقی میں ایک نمایاں کردار خواتین کا ہے۔ عصر حاضر کی عورت مرد کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہے۔ جدید دور میں عورت سماجی بڑھتی ضروریات کے پیش نظر گھریلو فرائض کے علاوہ کسی روزگار کی تلاش میں بھی سرگرداں رہتی ہے تاکہ وہ گھریلو آمدنی میں اضافہ کر سکے۔ عصر حاضر میں عورتوں کا باہر کسی بھی جگہ کام کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ خواتین خود تو معاشرتی سطح پر بہت متحرک ہیں مگر اس میں ان خواتین کا کچھ نقصان بھی ہے مثلاً

عورت کما کر لا بھی رہی ہے اور ساتھ ہی گھر کے سب کاموں کی بھی مکمل طور پر ذمہ دار ہے مرد خود کو گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد سمجھتے ہوئے ہر کام عورت کے ناتواں کاندھوں پر ڈال دیتا ہے اور عورت دوہرے عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں معاشرتی سطح پر ویسے ہی عورت کا استحصال جاری ہے مرد خود کو طاقت کا سرچشمہ سمجھتا ہے اور عورت کو پاؤں کی جوتی۔ بہت سی عورتیں غربت کی لکیر سے نیچے سطح پر اپنی زندگی گزارنے کی تگ و دو کر رہی ہیں ۔اس طبقے میں عورت ظلم کی چکی میں پستی ہے جب کہ مرد عیاشی کی زندگی گزارتا ہے اور بے فکرا نظر آتا ہے۔ عورت مشین کی طرح پورا دن کام کرتی ہے۔ شام اور رات کو بھی اسے سکون نصیب نہیں ہوتا۔ یہ استحصال صرف غریب عورت کا نہیں بلکہ آج کے جدید معاشرے میں عورت کے استحصال کے نت نئے طریقے سامنے آرہے ہیں جس میں عورت کو پیسہ یا سرمایہ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا جانے لگا ہے۔ عصر حاضر کی عورت زیادہ غیر محفوظ ہے کیونکہ عورت کو فی الوقت جو آزادی میسر ہے اس نے اس کی نسوانیت کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ عورت کو نسوانی تحریک کے باوجود آج بھی جائز مقام نہیں مل سکا ہے۔ جدید ترین عہد میں تو خاتون کو بطور کاروباری آلہ استعمال کیا جا نے لگا ہے۔ آج کا معاشرہ عورت کو برائی کے راستے پر چلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ عورت کو یہاں نمائش کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ کہنے کو تو عورت آزاد ہے مگر جہاں دیکھو وہ پابہ زنجیر نظر آتی ہے۔

۴۔ زبان و ادب کی معاصر صورت حال کو سامنے لانا

عصری شعور کے تحت ادیب زبان و ادب کی معاصر صورت حال سے آگاہ ہوتا ہے اسے زبان کی ارتقائی صورت حال سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ عصر کی بنیادی اکائی لمحے میں پنہاں ہے اور عصریت کی اساس فرد ہے۔ افراد کے باہمی تعلقات، عمل اور رد عمل کے نتیجے میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کی خبر گیری انسانی فطرت کا خاصہ ہے، ادب اس فطری ضرورت کے ادبی اطلاق کا فریضہ سر انجام دیتا ہے۔ ادب کا تعلق براہ راست زندگی اور سماج سے ہے۔ ادب اجتماعی تاثرات و تجربات کا آئینہ دار ہے۔ ادب ہمہ گیر موضوعات کو ماضی اور حال کے پیش نظر وسعت نظری سے بیان کرتا ہے۔ فکشن کا کام اپنے گرد و پیش میں رونما ہونے والے واقعات کو زمانۂ حال کے تناظر میں پیش کرنا ہے۔ یعنی فکشن کا براہ راست تعلق اپنے عصر سے ہے۔ ہر گزرنے والا لمحہ نئی واردات کو جنم دیتا ہے۔ لمحات کا باطنی ادراک عصری شعور کی بدولت ممکن ہے فکشن کا کام عصر کی حقیقتوں کا ادراک و اظہار ہے۔ فکشن زندہ لمحے میں

گزرے ہوئے لمحوں کے اثرات کو بھی شامل رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ فکشن کا کام ہمارے گرد وپیش کے تجربات و واقعات کو تخلیقی سطح پر پیش کرنا ہے۔ انسانی شعور کا تقاضا ہے یہ ہے کہ زندگی کو علمی سطح پر سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ جغرافیائی اور سماجی حالات کے پیش نظر ہر عصر کا اپنا مخصوص مزاج اور تقاضے ہوتے ہیں۔ ان تقاضوں کو ادیب اپنے ادب میں پیش کرتا ہے۔ فکشن دراصل اپنے عصری مسائل کو تخلیقی پیرائے میں پیش کرتا ہے فکشن کی تخلیق کے زیریں تہہ میں ادیب کا عصری شعور موجود ہوتا ہے۔

ادب کا تعلق کسی خاص فکر و فلسفے سے نہیں ہوتا ادب کا تعلق زندگی کے ہر شعبے سے ہے عصری شعور کو پیش کرنے کا سب سے بڑا وسیلہ فکشن ہے۔ ادب اپنے عصر کی زبان بن جاتا ہے۔ ادب فرد کی انفرادی ذات سے اجتماعی شعور تک اپنا کردار ادا کرتا ہے اس لیے ایک ادیب اپنے ادب میں اپنے اجتماعی لاشعور کی عکاسی کرتے ہوئے اپنے عصری شعور کی نمائندگی کرتا ہے۔

اردو ادب میں عصری شعور: روایت کا اجمالی جائزہ

اردو ادب میں عصری شعور سب سے پہلے ناولوں میں ہمیں نظر آتا ہے۔ مغربی ناول نگاروں نے تاریخی ناولوں کے ذریعے ماضی کو زندہ کیا اور عصری شعور کو اپنے ناولوں میں بیان کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ماضی کے لوگوں کا رہن سہن، معاشرہ، طرز زندگی، ماضی کے اہم واقعات اور سانحات کو عصری شعور کے ذریعے زندہ کر دیا۔ ہر عہد اور ہر معاشرے کے ادب میں ماضی کو شاندار اور خوبصورت دکھانے کے ساتھ ساتھ ماضی میں ہونے والی کوتاہیوں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ عروج کے ساتھ ساتھ زوال، بلندی کے ساتھ پستی کو بھی ادب میں جگہ دی گئی۔ اردو ادب میں عصری شعور کی اہمیت بہت زیادہ ہے جو ماضی سے چلی آ رہی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ سے قبل اردو ادب میں قصے، کہانیاں، تمثیلیں، حکایتیں اور داستانوں کا رواج تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کو جب بُری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا اور مسلم اقتدار کا مکمل طور پر خاتمہ ممکن ہوا اور انگریز کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس جنگ کے اختتام کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو اپنے بدلے کا نشانہ بنا دیا۔ کرم حیدر لکھتے ہیں۔

انتقام لینے میں انگریز سب سے آگے نکل گئے۔ ہر انگریز مقتول کے بدلے ایک سو ہندوستانیوں کو نشانہ بنایا گیا۔(۱۱)

انگریز نے ۱۸۵۷ء کی جنگ میں فتح کے بعد ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ اور بے حال و مدد گار مسلمانوں کے لیے معاشی و معاشرتی زندگی کے تمام معاملات میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ مسلمانوں کو ان کے حقوق سے دستبردار کر دیا گیا۔ پروفیسر احمد سعید جنگ آزادی ۱۸۵۷ کے بعد شکست مسلمانوں کی حالت زار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی بعد مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ حد تک خراب ہو چکی تھی۔
انگریز اُن کو ہندستان میں اپنی سلطنت کے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔
اس لیے انھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی ہر ممکن سعی
کی۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی مسلمانوں کے لیے آفات و مشکلات کا سرچشمہ
ثابت ہوئی۔ مُسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔"(۱۲)

۱۸۵۷ کی جنگ میں شکست سے جہاں مسلمانوں کا ساڑھے چھ سو سالہ (۱۲۰۶۔۱۸۵۷) دورِ حکومت اختتام پر پہنچا وہیں مسلمانوں کی طویل غلامی کا آغاز بھی شروع ہو گیا۔ مسلمانوں سے اُن کے عہدے چھین کر انگریزوں نے انھیں کوڑی کوڑی کا محتاج کر کے چھوڑ دیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ نے پورے ہندوستان میں ایک انقلاب کی شکل اختیار کر لی۔ اس جنگ نے نہ صرف لوگوں کی تہذیب و معاشرت اور رہن پر اپنے اثرات چھوڑنے بلکہ ادب کو بھی متاثر کیا۔ ان برے حالات میں سر سید احمد خان ایک مُصلح کے روپ سامنے آئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو ترقی یافتہ قوم بنانے کے لیے بہت کوشش کیں۔ سر سید احمد خان کی اصلاحی تحریک نے جہاں مسلمانوں کی زندگیوں پر نمایاں مثبت اثرات ڈالے وہیں ادب کو بھی کامیابی حاصل ہوئی اور نئی نئی اصناف وجود میں آئیں۔ ڈاکٹر عبد القیوم لکھتے ہیں۔

موجودہ اردو نثر نے جو ترقی کی ہے، اس کی ابتدا علی گڑھ تحریک کے اثرات کے ماتحت ہوئی تھی۔ (۱۳)

سر سید احمد خان اور اُن کے رفقا الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، نذیر احمد دہلوی، محسن الملک، وقار الملک، وحید الدین سلیم نے مسلمانانِ ہند کی تعلیم و ترقی میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ سر سید احمد خان نے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا، جس میں سٹیل اور ایڈیسن کی تقلید کرتے ہو مسلمانوں کی بہتری و فلاح کے لیے بے حد مضامین تحریر کیے گئے۔

مولوی نذیر احمد(۱۸۳۰۔۱۹۱۲)میں سب سے پہلے اردو ادب میں ناول نگاری کا آغاز کیا اور ۱۸۶۹ء میں پہلا ناول مراۃالعروس لکھا۔ کچھ ناقدین کے خیال میں مولوی نذیر احمد کے ناول، جدید ناول کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتا اس حوالے سے ڈاکٹر محمد احسن فاروقی لکھتے ہیں:

"اصلاح موعظت مولوی نذیر احمد کی گھٹی میں پڑی تھی۔اُن کی بچیاں جب لکھنے پڑھنے کی قابل ہو گئیں تو کوئی کتاب اردو میں ایسی نہ ملی جو اُنھیں اُمور خانہ داری اور عام اخلاقیات کا درس اس طرح دے سکتی جن میں اُن کم عمر بچیوں کو بھی دلچسپی ہوتی۔ چنانچہ مولوی نذیر احمد نے خود ایک قصہ گھڑا۔ جس کے اجزا وہ روزانہ لکھ کر بچیوں کے پڑھنے کے لیے دے دیتے تھے۔ یہی اجزا مکمل ہو کر مراۃالعروس کے نام سے طبع ہوئے۔(۱۴)

مولوی نذیر احمد کے ناول اُن کی ذات اور شخصیت ماحول کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں آپ کے تخلیق کردہ کردار مثالی ہیں۔ مولوی صاحب جس طرح کا معاشرہ چاہتے تھے اُسی طرح کا معاشرہ ان کے ناولوں میں دکھائی دیتا ہے۔ نذیر احمد ناول میں خود واعظ کرتے اور نصیحت کرتے نظر آتے ہیں اُن کے ناولوں میں طویل تقریریں دکھائی دیتی ہیں جس سے ناول اور اُس کے کردار ایک مخصوص پٹڑی پہ چلتے دیکھائی دیتے ہیں۔ مولوی نذیر احمد کے دیگر ناولوں میں فسانہ مبتلا،بنات النعش،توبتہ النصوح اورابن الوقت کے نام اہم ہیں۔ اردو ناول کی روایت میں عصری شعور کے حوالے سے ابن الوقت کا ذکر اہم قرار دیا جائے گا۔ مولوی صاحب نے یہ ناول ۱۸۸۸ء میں تحریر کیا تھا۔ مولوی نذیر احمد نے ملکی سیاست اور اپنے عہد کے کی تاریخ کو اس ناول میں بطور ایک کہانی کے بیان کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد ہندوستان کے حالات کی تصویر کشی اس ناول میں نظر آرہی ہے۔ اس ناول کی فضا میں عصری شعور سب سے نمایاں ہے۔ کیا نذیر احمد اس ناول میں عصری شعور کو پیش کرنے میں کامیاب نظر آرہے ہیں؟ اگر یہ سوال ہو تو اس کا جواب ررشید احمد گوریجہ کے الفاظ میں یوں ہو سکتا ہے۔

نذیر احمد نے مذہبی فکر کے ذریعے تاریخ کے بدلتے حقائق کو نبھانے میں کامیاب ہوئے رُجحانات کی نفی کرنے کی کوشش کی ہے۔(۱۵)

اس ناول میں نذیر احمد نے ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کے رویے اور مسلمانوں کی انگریزوں کے ساتھ یگانگت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ نقادوں نے نذیر احمد کے طرز خیالات اور نظریات کو سراہا ہے۔ انیس ناگی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> فسانہ مبتلا اگر نذیر احمد کی فنّی معراج ہے تو ابن الوقت ان کے نظریات کی تکمیل ہے۔ انھوں نے ابن الوقت میں جن تضادات اور ذہنی مجادلوں کو جس سطح پر پیش کیا ہے، وہ ان کی ذہنی رفعت، بالغ نظری اور عمیق ہم عصری شعور پر دلالت کرتی ہے۔ "ابن الوقت" تاریخی اور تمدنی دستاویز ہونے کے علاوہ اردو ناول کی فنّی روایت میں تصور سے واقعہ کی تشکیل اور کردار کی تعمیر کی طرف پہلی کامیاب کوشش ہے۔(۱۶)

۱۸۵۷ء کی جنگ کا سارا اثر مسلمانوں پر پڑا، اور اس جنگ کا ذمہ دار مسلمانوں کو قرار دیا گیا۔ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں سے کیا گیا تھا جنگ کے بعد عتاب کا نشانہ بھی مسلمان ہی بنے۔ ابن الوقت میں نذیر احمد نے شعوری کوشش کرتے ہوئے مسلمانوں کو غدر سے بری الذمہ قرار دینے کی سعی کی۔ انگریزوں کی مخصوص ذہنیت، مسلمانوں نے ساتھ اُن کا تحقیر آمیز رویہ اُس دور کی مخصوص طرز معاشرت، ان سب کا اظہار ابن الوقت میں موجود ہے۔ یہ ناول اپنے دور کے عصری شعور کا ترجمان نظر آتا ہے۔ اگرچہ نذیر احمد کے ناول فنی لحاظ سے ناول مخصوص پیمانے پر پورے نہیں اترتے ہیں مگر اُن کے تمام ناولوں میں ہمیں عصری شعور کہیں واضح کہیں دھندلا نظر آتا ہے۔ مراۃ العروس، بنات النعش، فسانۂ مبتلا میں ہمیں نذیر احمد کے دور کے سب بھی مخصوص معاشرت، طرز زندگی، رسم ورواج، تہذیب، رہن سہن، مخصوص کھانے، زبان، لباس، ادب آداب، زندگی گزارنے کے طور طریقے سلیقہ، معاشرتی حالات، گھریلو زندگی، سب کی مخصوص عکاسی دیکھائی دیتی ہیں۔ ابن الوقت میں ایک مخصوص دور کی سیاسی زندگی اُس دور کی تاریخ کی جھلکیاں واضح نظر آتی ہیں۔ بہت سی فنی خامیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولوی نذیر احمد کے ناول ابتدائی طور پر عصری شعور کے حامل ہیں۔

مولوی نذیر احمد کے بعد پنڈت رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۶۔۱۹۰۳) کے ناولوں میں عصری شعور نمایاں ہے۔ سرشار نے بطور مدیر "اودھ "اخبار میں ملازمت بھی کی۔ اس دور میں انھوں نے لکھنوی زندگی کی تہذیب و معاشرت

اور رہن سہن پر مختلف فکاہیہ کالم تحریر کیے۔ ان کے فکاہیہ کالم نے عوام میں قبول عام کا درجہ حاصل کیا۔ ایک سال کے عرصے تک سرشار نے یہ کالم لکھے۔ کچھ عرصہ بعد ۱۸۸۰ء میں انھیں فسانۂ آزاد کے نام سے تعارف کرواتے ہوتے کتابی شکل میں شائع کروادیا۔ فسانہ آزاد اڑھائی ہزار صفحات کا ضخیم ترین ناول ہے۔ یہ ناول واقعات کا ایک سمندر ہے۔ جو ہر واقعہ اپنے اندر سمندر کی طرح خوبصورتی ایک خاص لطف اور مزہ رکھتا ہے۔ مگر ناول میں ربط وضبط اور توازن کی کمی ہے۔ رام بانو سکسینہ تاریخ ادب اردو میں فسانہ آزاد کے حوالے سے پنڈت بشن نرائن کے بیان کا حوالہ دیتے ہیں:

> قصہ کا پلاٹ تو بہت سادہ بلکہ بے حد درجہ بے مزہ ہے مگر اڑھائی ہزار گنجان صفحے پڑھتے چلے جایئے، ذرا بد مزہ نہ ہویئے گا بلکہ سطر سطر پر اشتیاق بڑھتا جائے گا، محض اس وجہ سے کہ عبارت آرائی غضب کی ہے۔ طرز ادا نہایت بے تکلف اور آسان، تازہ اور نیچرل تمثیلی اور واضح۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ جابجا پر لطف ظرافت، پھڑکتے ہوئے فقرے، مزیدار شوخیاں، ترکی بہ ترکی جواب، حماقت آمیز مضحک باتیں جن کو پڑھ کر ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ (۱۷)

سرشار کی آرائشی نثر جہاں بیان میں خوبصورتی اور روانی پیدا کرتی ہے وہیں قصے میں لطف اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ ۱۸۵۶ء میں سقوط لکھنو کا سانحہ پیش آیا۔ جس نے لکھنو کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کو ہلا کر رکھ دیا۔ بادشاہ واجد علی شاہ کی حکومت زوال پذیر ہوئی اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی لکھنو حکومت زوال کا شکار گئی۔ موجودہ حالات کا عوام پر بہت بُرا اثر پڑا۔ فسانۂ آزاد میں سرشار نے لکھنو کی زوال پذیر تہذیب کو طنز کا نشانہ بنایا۔ اخلاقی طور پر عوام کی پس ماندگی کا ذکر مزاح کے پیرایہ عمل میں کیا ہے۔ سقوط لکھنو کی اصل تصویر کشی ہمیں فسانہ آزاد دیکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ اس حوالے سے یوں بیان کرتے ہیں:

> سرشار کے عہد میں ایک تاریخی عہد دم توڑ رہا تھا۔ دوسرا تاریخی عہد اس کی کوکھ میں جنم لے رہا تھا۔ ۱۸۵۶ء کے فوراً بعد لکھنو کو جس طرح آزاد نے پیش کیا ہے۔ کوئی مورخ بھی ایسے پر اثر انداز میں تاریخ بیان نہیں کر سکتا۔ سرشار نے صرف قصہ ہی تخلیق نہیں کیا بلکہ اس قصہ سے تنقید حیات کا کام بھی لیا ہے اور اپنے دور

کی تاریخ بھی قلم بند کرلی ہے۔(۱۸)

دیکھا جائے تو یہ بات درست ہے کہ سرشار نے اپنے عہد کے زوال کو بخوبی بیان کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ فسانۂ آزاد کے کردار، واقعات حقیقی زندگی کے قریب محسوس ہوتے ہیں گویا ایسے لگتا ہے جیسے ہمارے سامنے چلتے پھرتے کردار ہوں۔ ایسے ناول عصری شعور کو واضح کرتے ہیں جن میں واقعات عام انسان کے حقیقی زندگی کے قریب معلوم ہوتے ہیں۔ سرشار نے اپنے عہد کی سچی تصویر کشی اور منظر نگاری بیان کی ہے۔ ایسے ناول تحریر کرنا ایک بہت مشکل بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ ناول نگار تاریخ کو بیان کرتے ہوئے لوگوں تک حقائق اصل صورت میں پہنچانے کا معتبر حوالہ ہوتا ہے۔ تاریخی ناول نگار اپنے ناول میں تخیلی ماحول پیدا کرتا ہے مگر صرف اس حد تک کہ حقائق کسی صورت بدل نہ جائے بلکہ اور خوبصورتی سے نکھر کے سامنے آئے۔ عصری شعور کے حامل ناول کا مقصد قاری کو اکتاہٹ کا شکار کرنا نہیں بلکہ حقائق سے تخیل کے ذریعے تجسس کو اور زیادہ بڑھانا ہوتا ہے۔ تاکہ قاری کو اور بھی دلچسپی ہو جائے نہ کہ سچائی کو مسخ کرکے قارئین کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے۔ سرشار ناول میں منظر نگاری خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن مختلف علاقوں، معاشروں اور ملکوں کی تہذیب و معاشرت اور فضا کو لکھنو تہذیب و معاشرت کے لبادے اوڑھا دیتے ہیں۔فسانۂ آزاد میں ترکی کی فضا میں ہمیں لکھنو کی جھلک نظر آتی ہے۔

اردو ادب میں عصری شعور کے حوالے سے ایک بڑا نام سرشار کے بعد عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰ء۔۱۹۲۶) کا ہے۔ اردو میں تاریخی ناول نگاری کا باقاعدہ آغاز عبدالحلیم شرر کرتے ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر تاریخی ناول تحریر کیے ان کے ناولوں میں مسلم تاریخ کو موضوع بنایا گیا۔ شرر نے ناول نگاری میں تاریخی ناول کو اس لیے چُنا کہ وہ اپنے عصر کا شعور رکھتے تھے اور اپنی نوجوان نسل کو ایک نیا ولولہ دینا چاہتے تھے۔ اس حولے سے اشتیاق طالب یوں لکھتے ہیں۔

> تاریخی ناول لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جنگِ آزادی کے بعد مسلمان افسردہ دلی، مایوسی اور سراسیمگی کا شکار ہو کر رہ گئے تھے شرر نے نہ صرف انھیں مایوس کن فضا سے نکالنے کی کوشش کی بلکہ وہ اُن میں نئے عزائم، جوش و شجاعت کے جذبے اور نئی توانائی پیدا کرنا چاہتے تھے۔(۱۹)

عبدالحلیم شرر کا مقصد تاریخی ناول نگاری کے ذریعے مسلمانوں کو اُن کے بزرگوں کا شاندار ماضی یاد لانا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں ناکامیابی کے بعد مُسلمان شدید معاشرتی زوال کا شکار ہو گئے اور انھیں ہر طرف صرف مایوسی و ناامیدی نظر آ رہی تھی۔ یہ بات بہت واضح ہے کہ ادب نے ہمیشہ مایوس کن حالات میں پڑھنے والوں کی دلی تسکین کی ہے۔ ایک ادیب کا مقصد ہمیشہ سے لوگوں کو ایک نئی امید دے کر تازہ دم کرنا ہے۔ یہ طریقہ کار عبدالحلیم شرر نے اپنایا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں عصری شعور کے ذریعے مایوسی اور ناامیدی ڈوبی قوم کے ذریعے اُن کا ماضی، لا کھڑ کر دیا۔ تاکہ لوگوں میں نیا جوش، ولولہ اور انگریز مخالف سے لڑنے کی طاقت پیدا کی جاسکے۔ ۱۸۸۰ء میں منشی نو لکشور عبدالحلیم شرر کے اودھ اخبار کے ایڈیٹوریل سٹاف میں شامل رہے۔ لکھنے لکھانے کا شغف زوروں پر تھا۔ اودھ اخبار کے کے ذریعے شرر کو اپنے خیالات عوام تک با آسانی سے پہنچانے میں کامیاب رہے۔ اودھ اخبار کے ذریعے شرر نے کچھ عرصے میں بہت ساری تخلیقات کیں اس وجہ سے انھیں بہت مقبولت حاصل ہوئی۔ عبدالحلیم شرر خود لکھتے ہیں کہ

> میں نے اودھ اخبار اور رسالہ محشر میں بہت سے تاریخی، خیالی اور محققانہ
>
> مضامین لکھے، جو ملک میں بہت مشہور ہوئے اور پسند کیے گئے۔ (۲۰)

عبدالحلیم شرر کا تعلق لکھنو سے تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں دلی پوری طرح تباہ ہو گئی۔ دلی کی رونقیں، محفلیں، علم وادب کے سامان مکمل طور پر لکھنو منتقل ہو گئے شرر نے نے مسلمانوں کا زوال، انگریز کے مسلمانوں پر مظالم، سب حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے یہ وجہ بھی تھی اور اس کے ساتھ ہی شرر کو تاریخ سے بے حد دلچسپی تھی۔ لہٰذا شرر نے اپنے ناولوں میں تاریخ کو بنیاد بناتے ہوئے اپنے عصری شعور کو واضح کیا ہے۔ شرر نے مسلمانوں کے ایسے ادوار اور واقعات و شخصیات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے، جن کو پڑھ کر مسلمانوں میں جوش اور ولولہ پیدا ہو سکے۔ مسلمان اپنے اجداد کے کارناموں کو ناول میں زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھتے تھے کیونکہ ناول تاریخ کی کتاب کی نسبت زیادہ دلچسپ اور متاثر کن ہوتے ہیں۔ اور ساتھ ہی معلومات تک رسائی بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ شرر کے پیش نظر قوم کی اصلاح اور اپنی تاریخ سے دلچسپی پیدا کرنا اہم پہلو ہے انھوں نے اس نقطہ نظر کے تحت مسلمانوں کے ماضی

کے پہلوؤں کو اپنے ناولوں کا موضوع بنانے میں کامیاب ہوئے، جو کامیاب رہے۔ اس حوالے سے مولانا اصلاح الدین احمد لکھتے ہیں:

> شرر اپنے موضوع کے انتخاب ۲ میں بڑی زمانہ شناسی اور دور بینی سے کام لیا ہے۔ اس نے مسلمانوں کے زوال سیاست کے ذہنی ردِ عمل سے پورا فائدہ اٹھایا۔۔۔ ستاون کے ہنگامہ آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمان اس ملک میں کسی سیاسی تفوق کے تخیل سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ ان کا حال اور مستقبل دونوں غیر یقینی اور مانوس کن تھے۔ اس لیے فطری طور پر اُن کی روحانی نظریں بار بار اپنے شاندار ماضی کی طرف اٹھتی تھیں۔ شرر کی دانش وری نے یہ نکتہ پالیا۔(۲۱)

عبد الحلیم شرر نے تاریخی ناول نگاری پر توجہ دی اور مسلمانوں کی جذباتی تسکین کا خاص لحاظ رکھا۔ شرر کا ناول ملک العزیز ورجنا ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول عبد الحلیم شرر کا مشہور تاریخی ناول ہے۔ جس نے آغاز سے اردو ادب میں تاریخی ناول نگاری کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔ اور ساتھ ہی فنی اعتبار سے بھی یہ ناول پہلے اردو ناولوں کے مقابلے میں کامیاب ثابت ہوا۔ اس ناول میں مسلمانوں کی فلسطین میں اسلامی جدوجہد اور کامیابی کو موضوع بنایا گیا ہے کہ کن حالات میں کس طرح سلطان صلاح الدین نے عیسائیوں کا مقابلہ کیا ہے اس ناول میں صلیبی جنگوں کا بیان بہت خوبی سے ملتا ہے۔ اسی طرح ناول حسن انجلینا ۱۸۸۹ء میں سامنے آیا ہے۔ اس ناول کا اہم موضوع ایرانیوں اور ترکوں کے سُنی شعیہ اختلافات اور مسلمانوں کے انتشار کے منفی اثرات نیز رومیوں کے خلاف ترکوں کی جرات و بہادری کے واقعات بیان کیے ہیں۔ منصور موہنا شرر تیسرا ناول ہے جو ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا پہلے ناول کی طرح اس ناول میں بھی عصری شعور کی جھلکیاں ملتی ہے۔ اس ناول میں شرر نے مسلمانوں میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لیے سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان میں حق و باطلم معرکوں کو موضوع بنایا ہے بلکہ محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ تاریخی پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔

فلورا فلورنڈا ناول ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع "عبد الرحمٰن ثانی" کا تاریخی عہد ہے۔ اس ناول میں عیسائیوں اور اسلام دشمنوں کی مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جب مسلمانوں کی سپین میں اسلامی حکومت شروع ہوئی۔ دو جلدوں پر مشتمل شرر کا پانچواں تاریخی ناول ایام عرب سامنے آیا جو

۱۸۹۸ء۔۱۸۹۹ء کے عرصے میں شائع ہوا۔اس ناول میں اسلام کی آمد سے قبل دور جہالت کے تاریخی واقعات عرب کی اس دور کی معاشی، معاشرتی، تہذیبی و تمدنی حالات کو موضوع بنایا اور تاریخ کے اوراق سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ نیز آمدِ اسلام سے عرب کی بتدریج بہتر ہوتی ہوئی صورت حال کا احاطہ بھی کیا ہے۔ جب فردوس بریں ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا تو اس ناول میں ۶۵۱ھ سے ۶۵۴ھ کا تاریخی دور دکھاہے۔اس ناول میں فرقہ باطنیہ کا تاریخی پس منظر، سرگرمیاں، حسن بن صباح کا شر پسند کردار اور بالآخر ہلاکو خان کے ہاتھوں باطنی فرقے کی تباہی سامنے لانے کی کوشش کی گئی۔

مقدس نازنین ناول ۱۹۰۰ء میں طبع ہوا، اس میں پاپائیت و مسیحیت سے متعلق پر اسرار واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔اس کو نیم تاریخی ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔شوقین ملکہ ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔اس ناول میں ۵۳۹ھ کے تاریخی اوقات قلمبند کیے گئے ہیں۔ ناول عماد الدین زنگی اور صلیبی جنگوں کے واقعات کی تفصیل بیان کرتا ہے۔فتح أندلس۷ ۱۹۰ء میں منظر عام آیا۔اس ناول میں مسلمانوں کی جرأت و بہادری کے واقعات بیان کیے گئے ہیں کہ کس طرح مسلمانوں نے دلیری و بہادری سے صدیوں تک ہسپانیہ میں حکومت چلائی۔قیس و لبنیٰ۷ ۱۹۰ء میں طبع ہوا۔اس ناول کا پس منظر و پلاٹ رومانوی ہے۔اس ناول میں حضرت امیر معاویہ کے عہد کے تاریخی واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ماہِ ملک شرر کا گیارہواں ناول ہے جو۷ ۱۹۰ء میں منظر عام پر آیا۔اس ناول میں شرر نے تصرف سے کام لیا گیا ہے اور چند تاریخی واقعات کے علاوہ باقی تمام واقعات فرضی و خیالی شامل کیے ہیں۔فلپانا ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا اس ناول میں حضرت عثمانؓ کی خلافت کے تاریخی واقعات اور جنگ طرابلس کو موضوع بنایا گیا ہے زوالِ بغداد شرر کا تاریخی ناول ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔اس ناول میں تیرھویں صدی عیسوی میں خلافت بغداد کا انتشار، مسلمانوں میں فرقہ ورانہ تعصّبات و فسادات کو موضوع بناتے ہوئے شرر نے بغداد کے زوال اور تباہی کا ذمہ دار مسلمانوں کے آپس کے اختلافات کو قرار دیا ہے۔رومتہ الکبریٰ ناول ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔ جس میں شرر نے اسلام کی آمد سے قبل ابتدائی پانچویں صدی عیسوی تک کے روم کے سیاسی، اقتصادی و مذہبی حالات درج کیے ہیں۔یوسف و نجمہ ایک نیم تاریخی ناول شمار ہوتا ہے جو ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔اس ناول میں سلطان فیروز شاہ تعلق کے تاریخی دور کا احوال ملتا ہے الفانسو ناول ۱۹۱۵ میں شائع ہوا۔اس ناول میں "سسلی" کے ایک بادشاہ کے نیم تاریخی واقعات کو بنایا گیا ہے۔فاتح مفتوح ۱۹۱۶ء میں طبع ہوا۔اس ناول میں شرر نے دوسری صدی ہجری

میں مسلمانوں کی فتوحات کو موضوع بنایا ہے اس میں مختلف ممالک میں مسلم حکومت کا احوال ملتا ہے۔ بابک خرمی ناول ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع عباسی دور میں سر اٹھانے والی تحریکیں ہیں۔ تاریخی نوعیت اور حوالوں کے اعتبار سے شرر کا یہ ناول مفید مستند ثابت کیا جاتا ہے۔ جویائے حق تین حصّوں پر مشتمل شرر کا طویل ناول ۱۹۱۸ میں طبع ہوا۔ اس ناول میں قبل از اسلام عیسائیوں و عربوں کے عقائد و معاشرتی حالات، حضور پاک ﷺ کی سیرت طیبہ، حضرت پاک سلمانؓ کی سوانح نیز حضرت عمرؓ کا عہد بھی ذکر ہوا ہے۔ لعبت چین ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں پہلی صدی ہجری کے تیسرے ربع کی پوری تاریخ ملتی ہے۔ اس میں موسیٰؑ کی جدوجہد نیز مسلمانوں کی محنتوں و کوششوں کا ذکر اور عربوں و ترکوں کی جنگوں کی پوری تاریخ ملتی ہے۔ عزیز ہ مصر ناول ۱۹۲۰ میں طبع ہوا۔ اس میں احمد ابن طولون کے دور کے واقعات کا ذکر ہوا ہے۔ اس ناول میں شرر نے حقیقت و تخیل کو بیان کیا ہے۔ مینا بازار ۱۹۲۵ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں شرر نے حقیقت سے زیادہ فسانہ طرازی کو اپنایا ہے اور شاہجہان کے عہد کی معاشرتی زندگی اور حالات کا ذکر کیا ہے۔

شرر کے تاریخی ناولوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات واضح ہے کہ شرر نے مسلمانوں سے وابستہ تاریخی واقعات، فتوحات اور کارناموں کو نمایاں مسلم شخصیات اور سلاطین کو، اسلامی تاریخ اور اسلامی روایت کے سارے موضوعات کو اپنے ناولوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ شرر پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے تاریخ کو اپنے ناولوں میں زندہ کر کے اُردو ادب میں تاریخی ناول نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا ہے۔ ان کے ناول کے عصری شعور کے عمدہ عکاس ہیں۔

عبدالحلیم شرر کے بعد معاصر ناول نگاروں میں محمد علی طیب کا نام آتا ہے۔ جنھوں نے شرر کے مقابل تاریخی ناول لکھے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کے حوالے سے لکھتے ہیں: "اُدھر شرر کا ناول دلگداز میں چھپتا، اُدھر محمد علی طیب مرقع عالم میں ایک ناول چھاپ لیتے۔ (۲۲) محمد علی طیب نے تاریخی ناول نگاری کے حوالے سے لکھا ہے:

> اردو میں ایسے ناول تحریر کرنے چاہئیں جن کو پڑھ کر عامتہ الناس میں مذہبی جوش و خروش پیدا ہوا اور اپنے سے پہلے کے لوگوں کے سچے کارنامے ایک طرف ہمارے دل میں ایمان کا جوش بیدار کریں دوسری طرف بامقصد تفریح بھی حاصل کریں۔ ہم نے تاریخ کو ناول کے روپ میں پیش کرنے کا تہیہ اس لیے کیا ہے کہ آج کے لوگ اپنی تاریخ دلچسپ

انداز میں پڑھنا چاہتے ہیں۔(۲۲)

محمد علی طیب کا تاریخی ناول نگاری شروع کرنے کا مقصد شرر سے ملا ہوا ہے کہ مسلمانوں کو جذباتی طور پر سہارا دینا او رانھیں ذہنی انتشار سے نکال کر اُن میں نئی زندگی کی روح پھونکنا اور ایسا تب ہو سکتا ہے جب مسلمانوں کی تاریخ کو ناول کی صورت میں دلچسپ بنا کر منظر عام پر لایا جائے تاکہ تفریح کے ساتھ ساتھ اصلاحی مقصد بھی پورا ہو سکے۔ محمد علی طیب کے ناولوں میں عبرت،دیول دیوی اورجعفر و عباسیہ تاریخی ناول موجود ہیں۔ جو بہت مشہور ہوئے۔ محمد علی طیب کے ناول عبرت کو نسبتاً زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ ناول مرقع عالم میں ۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۲ء تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد کتابی صورت میں ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں محمد علی طیب نے اٹلی کی سرزمین کو موضوع بناتے ہوئے اپنی کہانی تخلیق کی ہے۔ محمد طیب نے مسلمانوں کے جوش وخروش کو بڑھانے کے مقصد سے اسلامی تاریخ واسلامی واقعات کو موضوع بنانے کی بجائے ایک دوسرے ملک کی سرزمین کو اپنے ناول میں سمویا ہے۔ جس سے قارئین کی دلچسپی کم دیکھائی دیتی ہے۔ جبکہ کردار اور اُن کے نام بھی غیر ملکی ہو تو اپنائیت کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں محمد علی طیب غلطی کرتے نظر آرہے ہیں۔ فضا انھوں نے اٹلی کی سرزمین وکھائی ہے جبکہ کردار کی بات چیت اور واقعات کی فضا پوری ہندوستانی دکھائی ہے جس سے ناول میں تضاد پیدا ہوا ہے۔ محمد علی طیب کا دوسرا تاریخی ناول جعفر و عباسیہ ہے۔ جعفر اور ہارون کی بہن عباسیہ کے معاشقے کو موضوع بنایا ہے۔ جس کی سند تاریخ میں موجود ہی نہیں۔ یہ ایک نیم تاریخی رومانوی ناول ہے۔ تیسرا ناول حضر خان دیول دیوی ہے۔ ناول میں ہندوستان کی فضا، رہن سہن اور تہذیب ومعاشرت کے نقشے سامنے آتے ہیں۔ لیکن اس ناول میں خیال آرائی سے کام لیا ہے جس نے اُن کی تاریخی ناولوں میں بہت سی خامیاں سامنے آجاتی ہیں۔

علامہ راشد الخیری(۱۸۶۸۔۱۹۳۶)کا نام عبد الحلیم شرر کے معاصرین کی اس فہرست میں اہم ہے، جنھوں نے عصری ناول نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ نذیر احمد دہلوی سے محمد طیب تک، تاریخی ناولوں ضمن میں ان کے ناولوں نگاروں کی مقبولت نے راشد الخیری کی تاریخی ناول نگاری کے لیے راہ ہموار کی۔ راشد الخیری "مُصورِ غم" کے نام مشہور ہیں۔ اس خطاب کے ملنے کی وجہ یہ ہے کہ راشد الخیری نے طبقہ نسواں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا دردناک لہجے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ راشد الخیری کا پہلا تاریخی ناول شاہین و ڈراج ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس

ناول میں ملکہ شاہین کا معاشقہ دیہاتی دراج سے بیان کیا ہے ملکہ شاہین سے نسبت کی بناء پر اسے تاریخی ناول میں شمار کیا جاتا ہے۔ماہ رعجم۱۹۱۸ء میں طبع ہوا۔اس ناول کا موضوع ایران کا تاریخی وسیاسی پس منظر، حضرت عمرؓ کے دور کی ایرانی فتوحات تھیں۔آفتاب دمشق۱۹۱۸ء میں منظر عام آیا ہے اس ناول میں حضرت ابو بکر صدیق کے ابتدائی عہد کے واقعات معرکہ آرائیاں، فتح شام کو موضوع قرار دیا ہے۔ محبوبہء خدا وند۱۹۱۹ء میں طبع ہوا۔اس ناول میں علامہ نے حضرت عثمانؓ کا عہد اور ملکِ طرابلس سے وابستہ واقعات سامنے لائے ہیں۔عروس کربلا۱۹۱۷ء میں طبع ہوا۔اس ناول میں علامہ کا عصری شعور ملتا ہے۔کیونکہ اس ناول میں بیان کردہ واقعات شامل ہیں۔اس میں حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت امیر مُعاویہؓ اور حضرت امام حُسینؓ کے عہد کو بیان کیا گیا ہے۔أندلس کی شہزادی ۱۹۲۰ء میں یہ ناول طبع ہوا۔اس ناول میں علامہ اندلس میں مسلمانوں کے اقتدار کے آخری ایام کو موضوع خطر رکھا۔دور شہوار ۱۹۲۰ء میں طبع ہوا۔اس کا موضوع ایران اور ماژندران کی باہمی آویزش ہے۔تاریخی اعتبار سے یہ ناول کمزور ناول میں شمار ہوتا ہے۔

یاسمین ۱۹۲۲ء میں طبع ہوا۔اس ناول میں مسلمانوں کی ایران اور دمشق میں فتوحات کو موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔اس میں علامہ نے ۱۲ھ سے ۱۶ھ تک کے واقعات کو بیان کیے ہیں۔تیغِ کمال علامہ راشد الخیری نے ترکوں کی سیاسی ومعاشرتی زندگی موضوع بنا کر اتاترک پاشا کے عہد کو پیش کیا ہے۔منظر طر ابلیس ناول ۱۹۲۰ء میں طبع ہوا۔اس ناول میں حضرت زبیرؓ کی سربراہی میں فتح طرابلس کو موضوع بنا کر پیش کیا ہے یہ ایک عام تاریخی ناول میں شمار ہوتا ہے۔جس میں دلچسپی کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔امینِ لادمِ واپسیں۱۹۲۷ء میں یہ ناول طبع ہوا۔اس ناول میں علامہ نے خلیفہ ہارون الرشید کے بیٹوں امین اور مامون کی آپس میں رنجش اور تخت نشینی کے لیے جنگ کو موضوع قرار دیا ہے۔وادعِ ظفر ناول میں شائع ہوا۔فنی حوالے سے یہ ناول اہمیت کی حامل ہے۔اس میں بہادر شاہ ظفر کے زوال کے واقعات کو دردناک انداز میں سمونے کی کوشش کی ہے۔علامہ راشد الخیری کا اسلوب بہترین ہے مگر پلاٹ پر گرفت کی کمی کی وجہ ناول کو اعلیٰ مقام حاصل نہیں ہوا۔

عصری ناول نگاری کا ایک اہم نام صادق حسین صدیقی سر دھنوی ہیں۔اُن کے ناولوں کو بہت مقبولیت حاصل ہیں۔صادق حسین نے اسلامی تاریخ کے اہم واقعات کو اپنے ناولوں کو موضوع بنایا ہے۔اس حوالے سے خود لکھتے

ہیں:"تاریخ یا تاریخی افسانے لکھنے سے ہمارا منشا یہ بھی تھا کہ قوم میں بیدار اور تاریخ سے دلچسپی لیں تا کہ پستی سے عروج کی طرف گامزن ہو سکیں۔"(۱۴) صادق حسین سردھنوی نے ۸۰ کے لگ بھگ ناول لکھے، جن میں تاریخی واقعات مسلمانوں کی فتوحات اور اسلامی شخصیات کو اپنے ناولوں میں رقم کیا ہے۔ فنی اعتبار سے صادق حسین کے ناول اعلیٰ مقام نہ بنا پائے مگر ان کے ہاں تاریخی واقعات کے بیان میں بھی بہت سی تاریخی لغزشیں پائی جاتی ہیں۔

اردو ادب میں عصری شعور کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادبی رسائل و جرائد نے بھی اہم کردار ادا کیا ان رسائل میں ایسے مضامین شائع ہوئے جنھوں نے معاشرتی ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔

فاطمہ حسن: تعارف:۔

فاطمہ حسن اردو ادب کی نامور محققہ اور ادیبہ ہیں۔ ان کا اصل نام سیدہ انیس فاطمہ ہے(۲۳) آپ کراچی میں ۲۴ جنوری ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوئیں۔(۲۴) فاطمہ حسن کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق شناختی کارڈ پر ان کی تاریخ پیدائش مئی ۱۹۵۲ء لکھی ہے وہ کہتی ہیں میرا کوئی قلمی نام نہیں بس آپ قلمی نام کے طور فاطمہ حسن لکھتی ہیں۔(۲۵)

فاطمہ حسن کے آباواجداد نماز پور کے رہائشی تھے جو کہ یوپی کے گاؤں "کاموس پور" کا علاقہ ہے۔ جد اعلیٰ شیر دار، ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ آپ کے نانا سید ظفر احمد کی اولادیں چھے بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ آپ کی والدہ کنیز فاطمہ بہن بھائیوں میں سے چھوٹی تھیں۔ آپ کی والدہ کا نام کنیز فاطمہ اور والد کا نام سید تہذیب الحسن تھا۔ آپ کے والد برٹش انڈیا میں فوج کے ادارے کے ساتھ منسلک تھے۔ آپ کا گھرانہ تعلیمی اعتبار سے پڑھے لکھے اور معزز گھرانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ آپ کے گھرانے کے بہت سے افراد اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ آپ کے والدین کی شادی ۱۹۴۹ء میں ہوئی تین سال بعد ۱۹۵۲ء میں فاطمہ حسن پیدا ہوئیں۔(۲۶)

فاطمہ حسن تمام بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہیں۔ آپ کے بعد چھوٹی بہن رئیس فاطمہ، تحسین فاطمہ، سیمیں، اور سب سے چھوٹی عندلیب فاطمہ ہیں۔ آپ کے بھائیوں میں مسرور حسن اور خاور حسن ہیں۔ آپ کی ایک بہن سیمیں اور بھائی خاور کا انتقال ہو چکا ہے۔(۲۷)

فاطمہ حسن نے ابتدائی تعلیم کا آغاز کراچی سے کیا۔ لیکن بعد میں ان کے والدین ڈھاکہ منتقل ہو گئے تو آپ نے مزید تعلیم ڈھاکہ میں ہی حاصل کی۔ آپ نے ۱۹۶۸ء میں "محمد پور گورنمنٹ گرلز اسکول" سے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا اور "ایڈن گرلز کالج" سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز اردو کیا۔ جب سانحہ مشرقی پاکستان (سقوط ڈھاکہ) پیش آیا تو آپ ۱۹۷۳ء میں خاندان سمیت کراچی واپس آ گئیں۔ اور جامعہ کراچی سے ایم۔ اے جرنلزم کیا اور ڈاکٹر اسلم فرخی کی زیر نگرانی ز۔ خ۔ ش (زاہدہ خاتون شروانیہ) کی حیات و شاعری پر مقالہ تحریر کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی۔ (۲۸)

فاطمہ حسن کی شادی ۳۰ مارچ ۱۹۸۴ء میں ہوئی۔ آپ کے شوہر کا نام شوکت علی زید تھا جو چارٹرڈ سول انجینئر تھے۔ ان کا انتقال ۴ جنوری ۲۰۲۲ء میں ہوا فاطمہ حسن اپنی شادی شدہ زندگی کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ

میرے شوہر کو شعر و ادب سے دلچسپی ہے شاید اسی وجہ سے انھوں نے ایک شاعرہ کا انتخاب کیا۔ (۲۹)

فاطمہ حسن فکری طور پر ایک اعلیٰ شخصیت کی حامل ہیں۔ خدا نے انھیں ہر موڑ پہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ انھی لحاظ سے فاطمہ حسن کی علمی و ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری فاطمہ حسن صاحبہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

فاطمہ حسن بنیادی طور پر ایک نیک انسان ہیں فاطمہ حسن سخت مذہبی

اور سخت بشر دوست ہیں اس کے ساتھ ساتھ سخت سوشلسٹ ہیں۔ (۳۰)

فاطمہ حسن انسان کے اندر کے جذبات کو اپنے قلم کے ذریعے سموتی ہیں۔ وہ ایک انسان دوست شخصیت کا جذبہ رکھتی ہیں وہ انسانوں سے جڑے جذبات کو اپنی شاعری کا عکس بناتی ہیں۔ کیونکہ فاطمہ حسن کی شاعری، ان کے خیالات اور احساسات کا آئینہ ہیں۔ آپ شاعرہ، محقق، نقاد، ادیبہ اور معلم کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں نسائیت کے حوالے سے اہم مقام رکھتی ہیں۔

فاطمہ حسن ۱۹۷۷ء میں محکمہ اطلاعات حکومت سندھ میں بحیثیت مدیر کے طور پر وابستہ ہوئیں اور ایک رسالہ "اظہار" نکالا۔ ۱۹۸۳ء تک انفارمیشن آفسر فلمز کا عہدہ بھی سنبھالتی رہیں۔ ۱۹۸۳ء میں ڈپٹی ڈائریکٹر سندھ ایمپلائز سوشل

سیکورٹی انسٹی ٹیوشن کے عہدے پر بھی مقرر ہوئیں۔ مئی ۲۰۱۲ء میں ڈائریکٹر تعلقات عامہ تربیت و تحقیق کی حیثیت سے ریٹائرمنٹ اختیار کرلی۔ ۲۰۱۱ء میں جامعہ کراچی کے شعبۂ ابلاغ عامہ میں تدریس کی خدمات انجام دینا شروع کیں۔ ۲۰۱۲ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد محمد علی جناح یونی ورسٹی سے بطور پروفیسر منسلک ہوئیں۔مارچ ۲۰۱۵ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان کی مصروفیات کی وجہ سے انھوں نے تدریس کا سلسلہ ترک کر دیا۔ آپ وفاقی جامعہ اردو میں سینٹ کی رکن بنیں اور یہاں انھوں نے دفتری اردو مراسلت کا ایک کورس انجمن کی باہمی امداد سے شروع کیا۔ جس میں اب تک مرحلہ وار پانچ گروہ تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کے ایماپر وفاقی جامعہ اردو سے متصل انجمن ترقی اردو کی قدیم عمارت میں "بابائے اردو چیئر "کا قیام بھی عمل میں آیا۔ جس کی آپ اعزازی ڈائریکٹر ہیں۔فاطمہ حسن علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد کی ایگزیٹو کونسل کی اہم رکن بھی ہیں۔ تاہم اقبال اکیڈمی، لاہور کی گورننگ باڈیز کے رکن کی حیثیت سے بھی کام سر انجام دے رہی ہیں۔(۳۱)

فاطمہ حسن کی انتظامی صلاحیتوں اور ادبی خدمات کو مد نظر رکھتے ہوئے اور ادبی خدمات کو مد نظر رکھتے ہوئے جناب جمیل الدین عالی نے ۱۹مارچ ۲۰۱۴ء کو انھیں انجمن ترقی اردو پاکستان معتمدہ اعزازی کا عہدہ دیا۔ ان کی صلاحیتوں اور ادبی خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں کئی ملکی و بین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا ہے۔انھیں حکومت پاکستان کی طرف سے صدارتی تمغہ امتیاز بھی دیا گیا ہے۔

فاطمہ حسن نے امریکہ، برطانیہ، ناروے، ترکی، بھارت، بنگلہ دیش، اٹلی اور حال ہی میں فرانس میں بین الاقوامی کانفرنسوں میں خصوصی شرکت کی اور خاص کر فیمنزم کے حوالے سے بے شمار مقالے پیش کیے۔اس کے علاوہ پاکستانی جامعات کے میلوں میں مسلسل شرکت کرتی رہی ہیں۔

فاطمہ حسن کی تصانیف:۔

فاطمہ حسن ہمہ جہت شخصیت ہیں۔انھوں نے شاعری کی مختلف اقسام میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کے چار شعری مجموعے بہتے ہوئے پھول(۱۹۷۷ء)،دستک سے در کا فاصلہ(۱۹۹۳ء)،یادیں بھی اب خواب ہوئیں،(۲۰۰۴ء)،اورفاصلوں سے ماورا(۲۰۱۹ء) شائع ہو چکے ہیں۔یہ مجموعے اردو ادب کے

مختلف حلقوں میں بے پناہ پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ پہلے تین مجموعہ ہائے کلام پر مشتمل کلیات یاد کی بارش کے عنوان سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔ فاطمہ حسن کی شاعری میں آج کی عورت کا رزمیہ بیان کیا گیا ہے۔ جو عورت کے سبھی رنگ اور تضادات نظروں کے سامنے مجسم کر دیتی ہے۔ فاطمہ حسن نے نثری نظمیں بھی لکھی ہیں ۔ اس کے ساتھ مختصر نظم اور ہائیکو بھی ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔ قمر جمیل کہتے ہیں۔

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ فاطمہ کی شاعری پر میرا کیا تاثر

ہے تو میں کہوں گا کپاس کا پھول جس میں آگ روشن ہے۔(۳۲)

فاطمہ حسن کی شاعری ان کے خیالات واحساسات کا خوبصورت آئینہ ہے۔ جس میں پورے دور کی عورتوں کا عکس نظر آتا ہے ان میں نئے زمانوں کے شعوری جنم لینے والی توانائیوں کا اثبات نظر آتا ہے۔ یہی سارے محاسن باہم ہو کر ان کی شاعری کو جدید معاشرے کی ایک نمائندہ شاعری کی مثال کی حیثیت دے رہے ہیں۔ نثری تخلیقات میں افسانوی مجموعہ کہانیاں گم ہو جاتی ہیں ،۲۰۰۰ء میں شائع ہوا اسی افسانے کا دوسرا ایڈیشن اضافہ شدہ کہانیوں کے ساتھ ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔ ان کی کہانیاں نسائی شعور کی عمدہ عکاس ہیں وہ عورت کے اس احساس کو رنگ دیتی ہیں جو اس کے وجود کا انفرادی رنگ ہے اسی احساس رنگ کی جھلکیاں ان کی تحریر کردہ کہانیوں میں موجود ہیں۔ فاطمہ حسن نے شاعری اور نثری اصناف کے علاوہ تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان میں ایک کتاب خاموشی کی آواز (نسائی تنقید) نسائی ادب اور تنقید پر مشتمل کردہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ فاطمہ حسن نے اس تالیف کے ذریعے نسائیت کی نئی جہت سے روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تالیف کردہ کتاب فیمنزم اور ہم خواتین کی تحریک نسائیت کی تاریخ سمجھی جاسکتی ہے۔

فیمنزم اور ہم ان کی نسائی تنقید کی ترجمان ہے۔ جس میں انھوں
نے فیمنسٹ اردو ادب کا انتخاب کیا ہے اس کے علاوہ انھوں
نے آصف فرخی کے ساتھ مل کر خاموشی کی آواز
اور ڈاکٹر شاہ محمد مری کے ساتھ مل کر بلوچستان کا ادب اور
خواتین مرتب کیں۔(۳۳)

ان کی تیسری تالیف بلوچستان کا ادب اور خواتین ہے جس میں انھوں نے بلوچ سماج میں عورت کی مختلف حیثیتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ کیونکہ اس سماج میں عورت کو اس کے جائز حق سے بھی محروم رکھا گیا۔ اس لیے وہ بلوچ عورت کے حق میں آواز میں اٹھاتی ہیں۔ فاطمہ حسن نے شاعرہ ز۔خ۔ش (زاہدہ خاتون شروانیہ) کی حیات و شاعری پر مقالہ لکھ کر جامعہ کراچی کے شعبۂ ابلاغ عامہ سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ اس مقالے میں ز۔خ۔ش کی حیات و شاعری اور تخلیقات و خطوط کو بہت مفصل بیان کیا ہے۔ ان کے علاوہ مدیر ماہ نامہ، قومی زبان کی حیثیت میں لکھے گئے درجنوں ادبی اداریے اور رپورتاژ بھی ان کے ادبی سرمائے میں شامل ہیں۔ فاطمہ حسن کا ایک مضامین کا مجموعہ کتاب دوستاں ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں معروف شخصیات کا تعارف اور ان کی تحریروں کا مطالعہ شامل ہے۔ حال ہی میں ان کی تصنیف اردو شاعرات اور نسائی شعور ۔ سو برس کا سفر کے عنوان سے شائع ہوئی جس میں انھوں نے ۱۹۲۰ء سے ۲۰۲۰ء تک کی اردو شاعرات کی شاعری کو موضوع بنایا ہے اس کتاب میں انھوں نے گویا خواتین کے نسائی شعور اور تانیثی تنقید کی تاریخ مرتب کر دی ہے۔

فاطمہ حسن نے منثور و منظوم تخلیقات کے ذریعے اردو ادب میں اپنی ادبی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ انھوں نے شاعری، افسانے، اداریے، رپورتاژ، تنقید و تحقیق ہر میدان میں اپنے قلم کے ذریعے جوہر دکھائے اور خود کو ایک منفرد ادیبہ کے طور پر متعارف کرایا بلکہ فاطمہ حسن نے شاعری میں اپنی منفرد صلاحیتوں کے ذریعہ شناخت بنائی جس کی وجہ سے ان کی شاعری کو قبول عام ملا۔

TH-27372

ان کے افکار و نظریات، نظم و نثر کے قالب میں ڈھل کر نسائیت سے روشناس کرنے کا وسیلہ بنتے ہیں۔ فاطمہ حسن نے کئی اصناف پر طبع آزمائی کی جن میں وہ کامیاب ادیبہ، شاعرہ اور نثر نگار نظر آتی ہیں۔ فاطمہ حسن کو جدید نظم نگار شاعرہ کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ ان کی نظمیں معاصر شاعری میں اپنی انفرادیت بنا چکی ہیں۔ فاطمہ حسن اپنی ہر کتاب میں، چاہے وہ نظم کی ہو یا نثر کی، اس میں اپنا نسائی شعور اجاگر کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ نسائی شعور اور فیمنزم کی تحریک سے متاثر ہونے کے باوجود ان کے ہاں مذہبی، اخلاقی، سیاسی، سماجی ادراک کی بدولت مضامین کی یکسانیت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ متنوع لحاظ سے اپنے عہد سے مربوط نظر آتی ہیں وہ ایک ہمہ جہت اور بھرپور انسان ہیں۔ جو زندگی کے اظہار میں اپنے تمام معاصرین کی ہم قدم ہیں۔ فاطمہ حسن نے اردو ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ معاصر

ادیبوں میں یہ حقوق نسواں کی علمبر دار خاتون کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ فاطمہ حسن کا محققانہ انداز، ناقدانہ انداز نظر، نسائیت اور شاعرانہ مزاج، تخیل کی بلندی کی وجہ سے ہی اپنے ہم عصر ادیبوں اور ناقدین میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔

ان کی تصانیف میں ہمیں جدید زندگی اور اس جڑے مسائل بہت سی سطحوں پر اظہار پاتے نظر آتے ہیں۔ ان کی تصانیف کا مزاج موضوعاتی اور حسیاتی سطح پر معاشرتی مسائل سے جڑا ہوا ہے۔ فاطمہ حسن نے اپنی تحریروں میں مختلف حوالوں سے انسانی استحصال کے نئے حربوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ معاصر زندگی کے سماجی، معاشرتی اور معاشی مسائل بیان کرنے کی بھی کاوش کی ہے۔ ان کی تصانیف میں زندگی اپنی تمام تر رنگا رنگی اور متلون مزاجی کے ساتھ نمایاں نظر آتی ہے۔

فاطمہ حسن کی شاعری میں عصری شعور:

فاطمہ حسن عصر حاضر کی عمدہ شاعرات میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کی شاعری میں بھی عصری شعور نمایاں ہے۔ آپ ایک سچی اور کھری شاعرہ ہیں وہ اپنے زور قلم سے تلخ حقائق منظر عام پر لاتی ہیں وہ بہت حقیقت پسند ہیں۔ اپنی نظم " بہتے پھول " میں لکھتی ہیں کہ

میں اپنے لرزیدہ ہونٹوں پر

بھاری لفظ اور

جھوٹی مسکراہٹ سجالیتی ہوں

میری کانپتی انگلیاں

قلم کا سہارا لیتی ہیں

اور صرف اپنا نام لکھتی ہیں

میں بہت حقیقت پسند ہوں

اور یہ سچ ہے کہ تم میرا جھوٹ نہیں پکڑ سکتے (۳۴)

فاطمہ حسن کی شاعری احساسات کی شاعری ہے اگر یوں کہا جائے کہ وہ احساس کی علمبردار ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ فاطمہ حسن معاشرے میں رونما ہونے والے ظلم و ستم، بے عزتی، ناانصافی کے ہر پہلو کو اپنی شاعری میں پیش کرتی ہیں۔ ان کی نظم وہ جو سوتے رہتے ہیں اس کی بہترین مثال ہے۔

ہر طرف اندھیرا ہے

آگ یوں تو جلتی ہے

آسمان کے نیچے

آگ جو جلاتی ہے

خواب اور امیدوں کو

آگ جو مٹاتی ہے

سب نشان محبت کے

پیڑ ہو صحرا ہو

دشت ہو کہ دریا ہو

سب کو چاٹ جاتی ہے

ان کو بھی جلاتی ہے

آگ جو لگاتے ہیں (۳۵)

فاطمہ حسن کی نظم "غلط ہے کتنا" میں معاشرے میں اجتماعی سطح پر زندگی کی پامالی اور جبر و تشدد، ظلم اور قتل و گارت جیسے واقعات مایوس کن اور حیرت انگیز ہیں۔ فاطمہ حسن ان تمام صورت حال سے نمٹنے کے لیے پیار و محبت اور

احساس کو اجاگر کرنے پر زور دیتی ہیں اور سماجی برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتی ہیں اس کے ساتھ ساتھ چونکہ انھیں معاصر صورت حال کا اندازہ ہے اسی لیے وہ سماج میں روا رکھے جانے والے غلط رویوں کو بھی سخت تنقید کا نشانہ بناتی ہیں۔

غلط ہے کتنا جو ہو چکا ہے

غلط ہے کتنا جو ہو رہا ہے

مگر بتائے یہ کون مجھ کو

کہ گرد میرے ہیں جتنے چہرے

وہ جھوٹ کی گرد میں اٹے ہیں

یہ شعبدہ گر کہ جن کے قول و عمل میں پایا

تضاد اتنا کہ آنکھ ان کے وجود کو

ایک شعبدہ ہی سمجھ رہی ہے(۳۶)

فاطمہ حسن صرف ماضی کو ہی نہیں بلکہ حال اور مستقبل کے ساتھ گہرا رشتہ استوار رکھتی ہے۔ فاطمہ حسن باریک بینی سے معاشرے کے ہر پہلو کا ادراک رکھتی ہیں۔ اور ان تمام تلخ حقائق کو بے نقاب کرتی ہیں۔ جو جھوٹ اور برائیوں والے عناصر میں ملوث ہیں۔ فاطمہ حسن ہر انسان کو ایک سچا، دیانتدار اور قول و عمل میں صاف اور خلوص کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ معاشرے میں محبت و سکون کی فضا کو برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔

فاطمہ حسن کے شعری تجربات اپنے عہد سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے داخلی اور خارجی و نفسیاتی مسائل کا پوری طرح ادراک رکھتی ہیں۔ فاطمہ حسن دراصل اس عورت کی شخصیت کی تلاش میں ہیں جو معاشرتی رویوں میں کہیں گم ہو کر رہ گئی ہے ان کی شاعری میں احساس کی گہرائی اور جذبے کی شدت بھی نمایاں ہیں ۔ فاطمہ حسن نسائی شعور کی توسیع بھی کرتی ہیں اور انفرادیت کا عکس بھی ان کی نظموں میں ملتا ہے۔ ان کی نظمیں عصری شعور سے لبریز ہیں۔

فاطمہ حسن دنیا میں ہونے والی تباہی و بربادی کے خلاف سرگرداں نظر آتی ہیں اسی طرح شہر کراچی کا دکھ نہ صرف اپنے دل پہ محسوس کرتی ہیں بلکہ اس کو اپنے فن کی زبان بھی دیتی ہیں ان کے اندر حوصلے کی طاقت بھی موجود ہے ۔ان کی نظم "اعتبار" بہترین مثال کے طور پر سامنے آتی ہے۔

اس دیے کو جلنے دو

اس دیے کی روشنی

سب کا اعتبار ہے

گھر نہیں جلائے گی

جس جگہ اندھیرا ہے

اس جگہ تو جلنے دو(۳۷)

فاطمہ حسن حوصلہ مندی سے آگے بڑھتی ہیں اور امید بھی رکھتی ہیں۔یہی خصوصیت ان کی ایک نظم میں موجود ہے کہ امید پہ دنیا قائم ہے اور رہے گی۔فاطمہ حسن ایک باحوصلہ، امید انگیز شاعرہ ہیں باوجود بہت سی مشکلات ان کے اندر ایک حوصلہ موجود ہے جو انھیں بہتر مستقبل کی جانب گامزن کرتا ہے۔فاطمہ حسن گھر اور معاشرے کو امن، خوش حالی کا گہوارہ بنتے دیکھنا چاہتی ہیں لیکن ان کے دل میں اداسی کی جھلک نمایاں ہے جو انھیں مضطرب و بے چین رکھتی ہے۔ان کے نمایاں موضوعات میں احساس کی کمی، رشتوں کا نہ ہونا، ناانصافی پر مبنی معاشرہ، گھروں کی عدم تشکیل، اداسی، دکھ، غم، رشتوں میں دراڑیں، خون کا سفید ہونا، نفرت، دشمنی، تنہائی شامل ہیں۔

فاطمہ حسن کی ایک نظم "آگہی" میں تنہائی کا احساس ابھر کر سامنے آتا ہے جہاں دکھوں اور غموں کے ساتھ تنہائی نمایاں ہے۔فاطمہ حسن کی اس نظم میں تنہائی کی کیفیت تہہ در تہہ حقائق کے ساتھ منکشف ہوتی ہے۔یہ نظم ان کے شعری تشخص کی ترجمانی کرتی ہے۔وہ حقیقت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ احساس میں ڈوبی ہوئی ہیں۔فاطمہ حسن اپنے عمر بھر کے تنہائی کے تجربات کو اپنی شاعری میں پیش کرتی رہی ہیں۔وہ کہتی ہیں کہ میں بھیڑ میں رہتے ہوئے بھی تنہا

رہی فاطمہ حسن کو تنہائی سے سخت اذیت کا سامنا کرنا پڑا اس لیے وہ اس تنہائی کو شاعری میں بیانگ دہل پیش کرتی ہیں ۔ان کی ایک نظم "گڑیا" میں بھی اسی قسم کے خیالات ملتے ہیں۔

تنہا جب ہوتی

بچی اپنی گڑیا سے

دکھڑے سب روتی (۳۸)

فاطمہ حسن کی تخلیقات ان کے شفاف تخیلات اور احساسات کی آئینہ دار ہیں۔ فاطمہ حسن کے شعری سرمایہ میں وطن سے محبت، سیاست، زندگی، اور دوسرے بہت سے تضادات کا اظہار بھی موجود ہے۔ ان میں دردمندی، شدت احساس، سچائی اور خلوص کا گہرا پن اور ذوق جمال بھی کار فرما ہے۔ ان کے الفاظ میں اظہار کا سلیقہ اور ان کی شعری معنویت میں تہہ داری اور گہرائی بھی ہے۔ ان کی شعری آواز میں توانائی، غصہ اور احتجاج نمایاں ہے۔ انھوں نے نہ صرف نثری نظم کے نئے امکانات تلاش کیے بلکہ اسے ایک مؤثر ذریعہ اظہار کے طور پر بھی اشعار میں ڈھالا۔ ان کے شعری تجربات اپنے عہد سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ گوپی چند نارنگ ان کی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں کہ

بے شک فاطمہ کا لہجہ ان کا اپنا لہجہ ہے۔ انھوں نے اپنی راہ

الگ بنائی ہے۔ دھوئیں اور بارود کے بادلوں میں جیسے چاندنی

کی کرنیں بجھی ہوں یا کوئی کلی تازگی اور تقدس کی اوس میں بھیگ

رہی ہو۔ (۳۹)

فاطمہ حسن کی دنیا محبت، پیار اور احساس کی دنیا ہے۔ ان کے یہاں کائنات کے متعلق پایا جانے والا عصری شعور عام انسانوں سے مختلف ہے۔ وہ دنیا کے ہر دکھ کو اپنے دل پر محسوس کرتی ہیں بلکہ اپنی شاعری میں اس فن کو بھی پیش کرتی ہیں۔ وہ بڑے فنکاری اور چابکدستی کے ساتھ اپنے فن میں اس کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کی نظم "دیوی" ان کے گہرے فلسفیانہ سوچ کا عکس ہے۔ فاطمہ حسن اپنے عہد کے تمام داخلی و خارجی مسائل کا مکمل طور پر ادارک کرتی ہیں۔

فاطمہ حسن نے اپنے جذبات واحساسات کی بھرپور ترجمانی بھی کی ہے۔فاطمہ حسن نے اس نظم میں سماجی حکمرانوں اور اقتدار کے سلسلے میں بھرپور انداز میں تحریر کی ہے۔فاطمہ حسن حکمرانوں کے رویوں پر سخت تنقید کرتی ہیں۔جو ظالم اور خود غرضی کی وجہ سے عوام کا بھلا نہیں کرتے۔غریب عوام پر اپنا دباؤ ڈال دیتے ہیں۔جس کی وجہ سے عوام غربت کی چکی میں پستے ہیں۔عوام کو ناانصافی کی وجہ سے عدل سے محروم کر دیا جاتا ہے۔بے انصاف حکمران اپنی خوشی اور بھلائی کی خاطر معصوم اور غریب عوام کی خوشیوں اور ان کے مال واسباب کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔جن کی وجہ سے عوام کی خوشیاں چھن جاتی ہیں اور انھیں موت کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔فاطمہ حسن چونکہ اپنے عصر کا گہرا ادراک رکھتی ہیں اس لیے وہ اس سب پر بھرپور احتجاج کرتی ہیں اور باغیانہ الفاظ میں دیوی سے خون کے بدلے خون اور انصاف کا مطالبہ کرتی ہیں۔نظم "دیوی" کا یہ اقتباس دیکھیے۔

دیوی اپنی لمبی عمر کی خاطر

خون کی بھینٹ طلب کرتی ہے

راج سنگھاسن پر بیٹھی یہ دیوی

اپنی شکتی کو میرے بچوں کے

معصوم ابلتے خون سے زندہ رکھتی ہے

دیوی ماں کی کوکھ اجڑنے کی تلخی کو

لمبی عمر کے ذائقے میں حل کر دیتی ہے

اور پی جاتی ہے

مائیں بچوں کو حسرت سے تکتی ہیں

ان کے خون کی قیمت کیا ہے

خون کی قیمت خون

دیوی ہم کو اپنا بچہ دے دے

ہم وہ تیری بھینٹ چڑھائیں

تیری لمبی عمر کی خاطر (۴۰)

فاطمہ حسن نے اس نظم میں دیوی کا استعارہ عصری حکمرانوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہی شاعری کی فنی خصوصیت ہے۔ انھوں نے نہایت پر اثر تمثیلات کا استعمال کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ علامات و استعارات کا استعمال بھی کیا ہے۔ فخر الحق نوری فاطمہ حسن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

فاطمہ حسن کی علامتیں بآسانی سمجھ میں آتی ہیں

فاطمہ حسن نے جو زبان اختیار کی ہے وہ آسان

مگر خوبصورت ہے اور ان کی نثری نظموں میں

تاثیر فراواں ہے۔ (۴۱)

فاطمہ حسن ایک باشعور اور عصری حسیت رکھنے والی شاعرہ ہیں۔ انھوں نے پاکستان کے ساتھ ساتھ کشمیر کے مسئلے کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان کے الفاظ ان کے عہد کے گواہ ہیں۔ ان کی نظم "کشمیر" میں درد مندی، خلوص کا گہرا پن، فکر میں گہرائی، اور جذبے کی شدت نمایاں ہے۔ فاطمہ حسن کشمیر کے دلکش، حسین نظاروں اور جنت نظیر وادی کے بارے میں اپنے دلفریب خیالات کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ ساتھ ہی دکھ بھرے انداز و جذبات میں کشمیر کے سیاہ دن کو بھی موضوع خیال بناتی ہیں۔ بھارت کے کشمیر پر کیے جانے والے ظلم و ستم، تشدد، جیسے واقعات و حالات سے بھی پردہ اٹھاتی ہیں۔ کشمیر کے حوالے سے اپنے تلخ حقائق اپنی شاعری میں سمو دیتی ہیں۔ کشمیر بہتے ہوئے خون کے پس منظر سے ابھر رہا ہے۔ وہ اپنی نظم میں کشمیری لوگوں کے دکھ درد کو شدت کے ساتھ محسوس کرتی ہیں اور مضطرب و بے چین ہو جاتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ

حسین جھیلوں پہ بجرے، کشتیاں

کنول کے پھول، اڑتی تتلیاں

اونچے چناروں سے سجے منظر

پرندے چہچہاتے ہیں

ہوائیں اڑتے پتے سرسراتے ہیں

عجب موسیقی ہے بکھری ہوئی

جیسے فضا میں ساز بجتے ہوں

یہ منظر میرے خوابوں میں

مرے بچپن کی یادوں میں

کہیں ٹھہرا ہوا ہے

پاس ہی اک اور منظر ہے

جو اس بستی میں جلتے گھر

سلگتی بین کرتی زندگی

اور بہتے خون کے سرخ پس منظر سے ابھرا ہے

مری آنکھوں میں ٹھہرا ہے(۴۲)

فاطمہ حسن کے موضوعات میں وسعت، تجربات، متنوع کیفیات شامل ہیں۔ جو بہت سبق آموز ہوتی ہیں۔ ان کا عصری شعور انھیں اس بات پر اکساتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے مسائل کو بیان کرتے ہوئے لوگوں کو ہمت و حوصلہ دلائیں۔ ان کی ایک نظم "حوصلے ہیں بلند" میں جرات اور حوصلے اور طاقت کا بیان ہے۔ وہ حساس شاعرہ ہونے کی حیثیت سے اس بات سے واقف ہیں کہ انسان، حوصلے اور ہمت سے ہی دنیا میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ حوصلے کے بغیر دنیا میں کامیاب نہیں ہوا جا سکتا ہے۔ وہ تلخ حالات میں دکھ کا اظہار کرتی ہیں کہ ہمت ہو تو سب دنیا کا نظام ٹھیک ہو جائے گا ۔ وہ لکھتی ہیں کہ

فکر و فن کے ہر اک زاویے سے

گزرتے ہوئے

آسمان پر ڈالیں کمند

حوصلے ہیں بلند!(۴۳)

فاطمہ حسن اپنے عصر کو اپنی شاعری میں پیش کرتی ہیں دہشت گردی عصر حاضر کا نمائندہ موضوع ہے۔ فاطمہ حسن کی نظم "یہ پھول وہ نہیں" میں دہشت گردی کے واقعے کی لفظی تصویر کشی کرتی ہیں جب ایک دلھن کو دہشت گردی کا نشانہ بنا کت قتل کر دیا گیا۔ اس نظم میں وہ کہتی ہیں

یہ کون لوگ ہیں رخصت کو کس کے آئے ہیں

سفید کپڑوں میں کس کو دلھن بنایا ہے

کسی نے گایا نہیں گیت رخصتی کا مگر

تمام لوگوں کی آنکھوں میں کیسے آنسو ہیں

بہت سے لوگ ہیں، رونق مگر نہیں گھر میں

اداس سہمے ہوئے آنسوؤں سے روتے ہوئے

لبوں کو بھینچتے ہوئے روکتے ہیں درد کی چیخ

خوشی کی کوئی رمق بھی نہیں ہے آنکھوں میں

اٹھائے ہاتھ میں پھولوں کی ایک چادر کو

بڑھا ہے کوئی مگر رک گیا ہے پل بھر کو

سرہانے اس کے کھڑا سوچتا ہے حسرت سے

جو آج سہرے میں سجتے یہ پھول وہ تو نہیں(۴۴)

نظم میں ان کے جذبات کی عکاسی اور بھرپور شعری رچاؤ کے ساتھ تلخی کا ذائقہ بھی موجود ہے۔ فاطمہ حسن انسانی نفسیات سے مکمل طور پر واقف ہیں۔ ان کا سماجی شعور بہت پختہ ہے اور ان کا وسعت مشاہدہ عام عوام کی نسبت تیز تر ہے۔ اس نظم میں انھوں نے بڑی چابکدستی سے موجودہ سماجی برائیوں کو پیش کیا ہے۔

فاطمہ حسن کی ایک نظم "سگ گزیدہ" ان کے نسائی شعور کی توسیع کرتی ہے۔ یہ نظم انفرادی رنگ لیے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ اس نظم میں فاطمہ حسن کا عصری نسائی شعور کھل کر سامنے آتا ہے۔ فاطمہ حسن نے اس نظم میں انسانی عظمت، کرب اور بے بسی، ہوس تشدد اور اس عہد کے ایسے ہی دوسرے سلگتے موضوعات کو زیر بحث لایا ہے
۔ عورت کی عصمت دری کرنے والے انسان نہیں درندے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سر عام پھانسی دینی چاہیے۔ یہ لوگ معافی کے قابل نہیں۔ فاطمہ حسن نے ہوس زدہ لوگوں کو کتوں سے تشبیہ دی ہے جن کی رال ٹپک رہی ہے۔ فاطمہ حسن اس سماج کے تلخ حقائق بڑی سچائی کے ساتھ بے نقاب کرتی ہیں۔

روتی ہوئی اک لڑکی

اور چاروں جانب کتے

دوڑ لگاتے، غراتے

رال ٹپکاتے

ٹوٹ پڑے اس لڑکی پر

جس کو راتب کے مانند

ڈال دیا تھا ان لوگوں نے

جو خود کتے ہیں

خون میں جن کے آمیزش ہے۔۔۔

ساری عمر کا حاصل ہے

جن کو بیٹے کہتی ہیں

وہ ان کے بھی تو قاتل ہیں(۴۵)

اسی طرح سے ان کی ایک نظم "وہ کس کے ہاتھوں ماری گئی" میں وہ باہمی رشتے، اجتماعی بگاڑ، اور دنیاوی معاملات کو احساسات کو بیان کرتی ہیں۔ وہ عدل وانصاف کو بھی اہمیت دیتی ہیں۔ انھیں سماج میں رشتوں کے تصادم کا دکھ بڑا ہے۔ باہمی رشتوں میں بگاڑ فاطمہ حسن کو مضطرب و بے چین رکھتا ہے۔ وہ امن وسکون اور پیار ومحبت کی قائل ہے۔ انھوں نے اجتماعی سطح پر زندگی کی پامالی، جبر و تشدد، ظلم اور قتل وغارت، دہشت گردی جیسے واقعات کو شعری قالب میں ڈھال کر نہایت تاسف کا اظہار کا بھی اظہار کیا ہے۔ اپنی نظم "فاصلوں سے ماورا" سے میں وہ لکھتی ہیں کہ

خیمۂ برف میں

حدت عشق سے

پرسکوں ہو سکوں

اتنی قربت ملے

ایسی شدت ملے

کیسی خواہش ہے یہ

کیسی بارش ہے یہ

جو بجھاتی نہیں

پیاس کو آگ کو(۴۶)

فاطمہ حسن نے اپنی شاعری میں عصر حاضر کے ان واقعات کو بھی پیش کرتی ہیں جن سے موجودہ پاکستانی معاشرہ متاثر ہوا ہے۔ شاعری کسی بھی شاعر کے جذبات واحساسات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ یہی جذبات وخیالات اور احساسات شعری آہنگ میں ڈھل کر سامنے آجاتا ہے۔ فاطمہ حسن اپنی نظم "نوحہ" میں سانحہ پشاور کو موضوع بناتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں

ان بچوں میں ہر اک بچہ میرا بچہ ہے

جس کو میں نے کوکھ میں رکھا جاگ کے پالا ہے

ان کے چہرے دیکھ کے آنکھیں خون رلاتی ہیں

کیسے زندہ پھولوں کو لاشوں میں بدلا ہے

خون آلودہ بستے، جوتے بکھرے چار طرف

دیکھ رہی ہوں ایک اک میرے جگر کا ٹکڑا ہے

کیسے ان پر صبر کروں میں ماتم کیوں روکوں

ان کے تن کا خون تو میرے دل میں رستا ہے(۴۷)

فاطمہ حسن کی ایک نظم "مزدور بچے" ہے انھوں نے اپنے عہد کے سارے واقعات و احساسات کو بڑی خوبصورتی سے اس نظم میں سمویا ہے۔ انھیں عصر حاضر کے تمام حالات و واقعات کا اندازہ ہے۔ فاطمہ حسن ان مزدور بچوں کا تذکرہ کرتی ہیں جن کے ہاتھ میں قلم اور کتاب نہیں اور وہ مشقت کر رہے ہیں۔ وہ لکھتی ہیں

سوچیے تو ذرا

جن کے ہاتھوں میں کاغذ، قلم اور کتابیں نہیں

ایسے بچوں کا ہونا ہے کیا؟

سوچیے تو ذرا

پیار ماؤں کو ان سے، بہت ہے مگر

جن کے ہونے سے سجتے ہیں گھر اور در

پھر بھلا کیوں مشقت کی خاطر

ہوئے ہیں جدا؟

سوچیے تو ذرا(۴۸)

فاطمہ حسن ان مزدور بچوں کی زندگی کو موضوع بنا رہی ہیں جن کے والدین غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ فاطمہ حسن ان بچوں کا دکھ محسوس کر رہی ہیں۔ یہ وہ بچے ہیں جو چھوٹی عمر میں ہی خاندان کا پیٹ بھرنے کے لیے تعلیم کی بجائے چھوٹے موٹے کاروبار کر رہے ہیں۔ فاطمہ حسن ان بچوں کے بارے میں کئی سوالات سوچنے کے لیے دیتے ہیں کہ کیا ان بچوں کی مشقت سے روشن راہیں کھل جائیں گی؟ کیا وہ انسان بھی بن سکیں گے یا نہیں اور آنے والے دنوں میں ان بچوں کا کیا مستقبل ہو گا؟ فاطمہ حسن چاہتی ہیں کہ ان بچوں کو تعلیم سے روشناس کرا کر ایک اچھا انسان بنایا جائے۔

فاطمہ حسن کی شاعری میں عصری موضوعات بار بار نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری سماجی سچائی، امن و آتشی، اور انسان دوستی پر مبنی ہے جس میں عصری شعور واضح ہے۔

حوالہ جات

۱۔https://www.rekhtadictionary.com/meaning-of-Asar?lang=ur تاریخ ملاحظہ ۲۹ اگست ۲۰۲۲،بوقت سہ پہر ۰۳:۳۰

۲۔اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری، جلد دوم، برطانیہ: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۳، ص۔ ۸۹

۳۔سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ جلد سوم مرتبہ خورشید احمد خان، لاہور: مکتبہ حسن سہیل، ۱۹۸۳ء۔ ص ۔۲۸۶

۴۔https://www.rekhtadictionary.com/meaning-of-shuuur?lang=ur تاریخ ملاحظہ ۲۹ اگست ۲۰۲۲،بوقت سہ پہر ۰۳:۳۰

۵۔انور سدید، ادب عصری آگہی اور انشائیہ، مشمولہ ادبی زاویے، کل پاکستان اہل قلم کانفرنس ۱۹۸۳ء کے مقالات کا مجموعہ، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ص۱۹۹۔ ۱۹۸۳ء۔

۶۔کامران کاظمی، اردو ناول اور عصریت، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۲۳ء، ص ۶۴۔

۷۔جمیل جالبی، نئی تنقید، مشمولہ ادبا اور عصری آگہی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۸، ص ۲۸۴۔

۸۔فضیل جعفری، ادب میں عصریت کا مفہوم، مشمولہ ذہن جدید ، سہ ماہی مارچ اپریل، مئی ۱۹۹۱ء، ص ۱۷۔

۹۔لطف الرحمٰن، جدیدیت کی جمالیات، بھیونڈی، صائمہ پبلی کیشن، ۱۹۹۳، ص ۱۳۱۔

۱۰۔https://www.nytimes.com/1971/05/11/archives/beyond-contemporary-consciousness.html تاریخ ملاحظہ ۹ ستمبر ۲۰۲۲، وقت صبح ۱۱:۰۴۔

۱۱۔ کرم حیدری، مسلمانانِ برصغیر کی جدوجہد آزادی میں مسلم لیگ کا کردار، اسلام آباد: نیشنل پریس ٹرسٹ، ۱۹۸۶ء، ص ۳۸۔

۱۲۔ احمد سعید، حصول پاکستان، لاہور: نیو کریسنٹ پبلشرز، ۱۹۷۲ء، ص ۹۔

۱۳۔ عبدالقیوم، حالی کی اردو نثر نگاری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۸۵۔

۱۴۔ محمد احسن فاروقی، ناول کیا ہے، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۴ء، ص ۱۴۳۔

۱۵۔ رشید احمد گوریجہ، اردو میں تاریخی ناول، لاہور: ابلاغ، ۱۹۹۴ء، ص ۱۳۹۔

۱۶۔ انیس ناگی، ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری، لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۸۸ء، ص ۵۱۔

۱۷۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص ۴۱۶۔

۱۸۔ رشید احمد گوریجہ، اردو میں تاریخی ناول، ایضاً، ص ۱۳۹۔

۱۹۔ اشتیاق طالب، تمہید، کراچی: مشتاق بک ڈپو، ۱۹۸۳ء، ص ۸۶۔

۲۰۔ عبدالحلیم شرر، آپ بیتی، مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر، لاہور: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۹۰ء، ص ۵۶۵۔

۲۱۔ صلاح الدین احمد، شرر کی ناول نگاری، مشمولہ صریر خامہ جلد دوم، دہلی: پی کے پبلی کیشنز، ۱۹۶۹ء، ص ۲۶۲۔

۲۲۔ سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، دہلی الحمرا پبلی کیشنز، ۱۹۷۲ء، ص ۱۶۷۔

۲۳۔ احمد حسین صدیقی، دبستانوں کا دبستان کراچی، کراچی: محمد حسین اکیڈمی، ۲۰۰۳ء، ص ۳۳۴۔

۲۴۔ ایضاً،

۲۵۔ فاطمہ حسن، انٹرویو، بمقام اکادمی ادبیات، اسلام آباد: جون ۲۰۲۲ء۔

۲۶۔ ثوبیہ خانم، فاطمہ حسن فن و شخصیت تحقیقی جائزہ، غیر مطبوعہ مقالہ، کراچی: شعبۂ اردو جامعہ کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ فاطمہ حسن، انٹرویو، بمقام اکادمی ادبیات، اسلام آباد: جون ۲۰۲۲ء۔

۲۹۔ ایضاً،

۳۰۔ شاہ محمد مری، بے کل شہر میں شانت آتما، کراچی: کتابی سلسلہ پبلی کیشنز ۲۰۰۸ء، ص ۴۷۔

۳۱۔ فاطمہ حسن، انٹرویو، بمقام اکادمی ادبیات، اسلام آباد: جون ۲۰۲۲ء۔

۳۲۔ قمر جمیل، (پیش لفظ)، دستک سے در کا فاصلہ از فاطمہ حسن، کراچی: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵۔

۳۳۔ فاطمہ حسن، فیمنزم اور ہم، کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۵ء، ص ۱۱

۳۴۔ فاطمہ حسن، بہتے ہوئے پھول، کراچی: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص ۳۵۔

۳۵۔ فاطمہ حسن، دستک سے در کا فاصلہ، ایضاً، ص ۶۲۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۶۵۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۷۱۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۹۳۔

۳۹۔ گوپی چند نارنگ، مضمون مشمولہ دبستانوں کا دبستان کراچی، ایضاً، ص ۳۳۶۔

۴۰۔ فاطمہ حسن، یادیں اب خواب ہوئیں، کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۴ء، ص ۳۹۔

۴۱۔ فخرالحق نوری، نثری نظم، لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۸۹ء، ص ۱۳۶۔

۴۲۔ فاطمہ حسن، یادیں اب خواب ہوئیں، ایضاً، ص ۴۹۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۵۳۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۶۵۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۴۵۔

۴۶۔ ایضاً، ص ۴۹۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۵۶۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۴۲۔

باب دوم

فاطمہ حسن کی تحریروں میں سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر ردعمل کا اظہار

باب دوم

فاطمہ حسن کی تحریروں میں سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر ردِ عمل کا اظہار

فاطمہ حسن عصر حاضر کا ایک بڑا نام ہے جنھوں نے اپنی تحریروں میں معاشرتی اور سیاسی مسائل کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اگر اردو ادب کی ابتدائی تخلیقات میں خواتین کی نمائندگی دیکھی جائے تو عورتیں ڈھکے چھپے الفاظ میں لکھتی تھیں یہاں تک کہ وہ اپنا نام و نشان تک ظاہر نہ کرتی تھیں لیکن اب فاطمہ حسن جیسی بہادر خواتیب نہ صرف کھل کر لکھ رہی ہیں بلکہ اپنے جذبات و احساسات کو عمدہ اظہار اپنی تحریروں میں کر رہی ہیں۔ اس طرح وہ اپنی الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہو رہی ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنی شاعری بلکہ اپنی نثر میں بھی بنیادی انسانی حقوق اور معاشرے میں انسانی حقوق کے لیے عملی جدوجہد کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ایک طرف پدری سماج سے بیزاری، خواتین کی سماجی حیثیت کی بحالی، تہذیبی اقدار و روایات کی پاسداری، ملک کے سماجی، سیاسی و اقتصادی مسائل کا ادراک نظر آتا ہے تو دوسری طرف کہیں کہیں ان کی تحریروں میں ان مسائل کا حل بھی نظر آتا ہے۔

فاطمہ حسن کا افسانوی مجموعہ کہانیاں گم ہو جاتی ہیں تمام کا تمام معاشرتی و سماجی سماجی مسائل کا پس منظر واضح کرتا ہے۔ اس مجموعے کی پہلی اشاعت ۲۰۰۰ء میں ہوئی اس وقت سے اب تک ان کہانیوں کئی مرتبہ شائع کیا جا چکا ہے۔ اس مجموعے میں ان کی کل ۲۴ کہانیاں شامل ہیں اور ایک کہانی کا ترجمہ "رضائیوں والا گھر" کے عنوان سے شامل ہے۔

۱۔ بلیک آرٹ ۲۔ پری میچور برتھ ۳۔ عام سی لڑکی ۴۔ چھوٹے بڑے لوگ ۵۔ چھتیس نمبر ۶۔ وقت اور فاصلہ ۷۔ چوتھے کونے کا آسیب ۸۔ سفر میں ۹۔ جھوٹے پھل ۱۰۔ بدلتی ہوئی جون ۱۱۔ تلاش ۱۲۔ زمین کی حکایت

۱۳۔ کہانی ایک شہزادی کی ۱۴۔ وہ بچہ ۱۵۔ ٹھہری ہوئی یاد ۱۶۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی ۱۷۔ بے چاری

۱۸۔ حصار ۱۹۔ وزیر مر گیا۔ وزیر زندہ ہے۔ ۲۰۔ خریدار ۲۱۔ تم کو رقم کریں گے ۲۲۔ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا؟

۲۳۔ مہلت کا وقفہ ۲۴۔ بیگم اعجاز

اس مجموعے میں شامل یہ تمام افسانے سماجی رویوں اور عورت کے مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں ان کی کہانیوں میں سادگی، سلاست اور روانی موجود ہے۔ فاطمہ حسن اپنی کہانیوں میں ہمارے اطراف کے کرداروں کو جوڑ کر کہانی بناتی ہیں۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کہتی ہیں کہ

> یہ کہانیاں ایک ایسی لڑکی کی نظر کا زاویہ ہیں جو شہر ذات
> کے چیستاں میں گم ہو گئی ہے اسے باہر کی آزاد فضاؤں کا
> ذائقہ اپنی طرف بلاتا ہے۔ وہ اپنے پاؤں سے لپٹی ہوئی
> توقعات کی زنجیر سے رہائی چاہتی ہے اسے ایک آزاد اور
> مستقل حیثیت میں قیام کرنے کی تمنا ہے مگر زندگی جب
> الجھے ہوئے دھاگوں کا گولہ بن جائے تو اسے سلجھانے
> کی کوشش اسے توڑ دیتی ہے۔(۱)

ان کے ہاں کہانی کا پلاٹ زندگی میں ہونے والے واقعات کے بہت قریب تر ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جو کردار ان کے ہاں ہیں وہ زندگی کے اصل کردار ہیں ان کی کہانیاں گہرے سماجی شعور کی عکاس ہیں۔ مثلاً ان کی پہلی کہانی بلیک آرٹ ہے جس میں لڑکی کہتی ہے۔

> مگر میں بھول گئی کہ لڑکوں سے دوستی میں بھی کچھ برائی ہے۔
>
> جب میں نے اپنے دوست بنائے تو اس نے مجھے آوارہ کہہ دیا۔(۲)

یعنی معاشرہ کسی عورت کا مرد سے کوئی بھی تعلق برداشت نہیں کرتا۔ جگہ جگہ معاشرتی قدغنیں عورت کے پاؤں کی بیڑیاں بن جاتی ہیں اور وہ معاشرتی ارتقا میں اپنا کردار پورے طور سے ادا نہیں کر سکتی۔ فاطمہ حسن سماج کے اس رویے کا مکمل ادراک رکھتی ہیں۔ وہ سماجی تلخ حقائق کو اپنی کہانیوں میں پیش کرتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں عورتوں کے

طرز زندگی، ان کے مسائل اور ان پر ہونے والے جبری رویوں کا اظہار ملتا ہے۔ فاطمہ حسن تمام سماجی،، سیاسی، ادبی مسائل، رجحانات اور میلانات کا مکمل شعور رکھتی ہیں۔

ان کی ایک عمدہ کہانی "چھوٹے بڑے لوگ" ہے جس میں معاشرے کے ایک اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو کہ تقریباً ہر سماج کا مسئلہ ہے یعنی کہانی میں طبقاتی نظام کی کش مکش کو عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کہانی نہایت اختصار سے تحریر کی گئی ہے جس میں دو کردار دکھائے گئے ہیں۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ لڑکی کا تعلق امیر خاندان سے ہے وہ سماجی کش مکش میں بری طرح پھنسی نظر آتی ہے۔ کہانی میں اس لڑکی کی ذہنی ونفسیاتی کش مکش کو موضوع بنایا گیا ہے ۔ لڑکے کا کردار مکالمے کے طور پر کہانی میں سامنے آتا ہے۔ کہانی میں دوسرا سماجی پہلو دکھاوے کا سامنے آتا ہے مثلاً

تم نے بہت سی کتابیں جمع کی ہیں ان میں سے ایک پہاڑ اور کچھ دیر اس پر

کھڑی ہو جاؤ دیکھنا سارے قد والے تمھارے سامنے جھک جائیں گے۔(۳)

اس اقتباس سے فاطمہ حسن کے اسلوب کا حسن واضح ہوتا ہے کہ وہ کیسی خوبصورتی سے تصنع وبناوٹ کا پردہ چاک کرتی ہیں کیونکہ تعلقات کا استعمال کر کے اونچا مقام حاصل کرنا اس معاشرے کا عام چلن بن گیا ہے انھوں نے دبے الفاظ میں اس طبقاتی ظلم کی نشاندہی کی ہے۔ اور پاکستانی سماج کی عکاسی کی ہے۔ اپنی کہانی تلاش میں لکھتی ہیں۔

میرے سامنے لوگ بکھرے پڑے ہیں۔ کتنے ہی چہرے ہیں کچھ چہرے مانوس

ہو کر بھی اجنبی ہیں اور کچھ ایسے اجنبی جن سے کبھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔(۴)

ان کی کہانیاں سماج پر گہر اوار ہیں۔ ان کی تحریروں میں ڈھکے چھپے الفاظ میں اشرافیہ طبقے کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ مثلاً افسانہ "زمین کی حکایت میں" عام طبقے کی مظلومیت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس افسانے میں شہر کے لوگوں کے متعلق واضح لکھا گیا ہے کہ شہر کے لوگوں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں تھیں اور جن کی آنکھیں کھلی تھیں وہ بھی نظریں چار کرنے سے کترا رہے تھے ایسے میں زبانیں بھی بند تھیں انھیں ڈر تھا اگر وہ کچھ بولے تو اسے آنکھوں کا دیکھا نہ سمجھا جائے البتہ کان سب کے کھلے تھے اور شہر کے حاکم کی طرف سے اعلان تھا کہ جو کچھ اس کی طرف سے کہا جا رہا ہے وہ ضرور سنا جائے۔ پھر ان کے پاس سننے کے سوا کچھ رہا بھی نہیں تھا۔ شہر کے حاکم کی طرف سے کچھ لوگ مقرر

کر دیے گئے تھے جو مسلسل کچھ نہ کچھ کہتے رہتے تھے جن کی اکثر باتیں شہر کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ مگر شہر کے حاکم نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جو باتیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں وہ ضرور سنی جائیں کہ یہ سب کچھ اس لیے کیا جارہا ہے کہ آنکھوں اور زبانوں کی طرح کانوں کو بھی اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ سن کر بھی نہ سن سکیں۔ یعنی کہانی میں شہر کے لوگوں کو حاکموں کی بات پر گونگے بہرے بن کر رہنے اور سماج کے خلاف زبان بندی کی تلقین ان سماجی مسائل کی عکاسی ہے جس سے اس وقت کا پاکستانی معاشرہ دوچار ہے۔ جیسے فاطمہ حسن اپنی کہانی "کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا؟" میں لکھتی ہیں۔

سیلاب شہر پہ شہر ڈبو رہا تھا۔ بستیاں اجاڑ رہا تھا۔ زمین ان سب کے قدموں
کے نیچے سے سرک رہی تھی اور وہ آسمان پر نظریں جمائے اس اڑن کھٹولے
کا انتظار کر رہے تھے جس سے وزیر اعلیٰ اترنے والا تھا۔(۵)

پاکستان کو جو چند بڑے مسائل درپیش ہیں ان میں بدعنوانی سب سے پہلے نمبر پر ہے۔ چند ادارے بدعنوانی کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں، اگر ان کو صحیح کر دیا جائے تو ملکی حالات بالکل بدل سکتے ہیں جیسے، پولیس اور دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کا نظام شفاف بنانے کی اشد ضرورت ہے، اس کے ساتھ ساتھ قانونکے ادروں اور عدالت کے نظام کو بہتر بنانے کی زبردست گنجائش موجود ہے۔ اس کے علاوہ بجلی و پیٹرولیم کی فراہمی کے ادارے، ٹیکس جمع کرنے والے ادارے، کسٹمز، تعلیم و صحت سے متعلق ادارے، زمین و جائیداد کا انتظام و انصرام کرنے والے ادارے، ان سب اداروں میں نہایت ہی اعلیٰ درجے کی اخلاقی و پیشہ ورانہ تربیت کے ساتھ ساتھ بدعنوانی کرنے والے افراد کو قرار واقعی سزائیں بھی دی جانے کی شدید ضرورت ہے جو یقیناً ملک میں بدعنوانی کو کم کرنے اور حالات کو ملک کے موافقت میں لانے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس ضمن میں پارلیمنٹ قانون سازی کے ذریعے اہم ترین کردار ادا کر سکتی ہے، جو اداروں کو قانونی اور آئینی طاقت فراہم کرنے کا سبب ہو سکتی ہے جن کے زیادہ سے زیادہ استعمال سے حکومتی سطح پر شفاف احتساب کے ذریعے بہترین نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ فاطمہ حسن لکھتی ہیں۔

یہاں خود مختاری صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو صاحب رسوخ ہیں۔

عام لوگوں کے لیے سب قاعدے قوانین سرکاری ہیں۔(۶)

فاطمہ حسن کی تحریریں اس ضمن میں بہت اہم ہیں جن میں سماجی صورت حال کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ پاکستان کے ہر ادارے میں رشوت اور سفارش بہت عام بات ہے۔ جیسے وہ اپنے افسانے "وہ بچہ" میں لکھتی ہیں۔

اس ہسپتال میں ایک انٹرنیشنل ورکشاپ ہو رہا تھا۔ ورکشاپ میں شرکت کے

لیے بھی سفارش چل رہی تھی۔(۷)

ان کے افسانے سماجی سطح پر مختلف موضوعات کو بیان کرتے ہیں۔ افسانہ "خریدار" مسلمان حکمرانوں کے بارے میں بنیادی فکر کے دروازے کھولتا ہے۔ مثلاً اس افسانے میں مسلمان حکمرانوں کے بارے میں سوال اٹھایا گیا ہے کہ ہر خوبصورت عمارت کو مقبرہ بنانے کا شوق ہمارے حکمرانوں کو کیوں ہو رہا ہے؟ ہندوستان میں آنے والے حکمرانوں میں ہمایوں کی قبر سے تاج محل تک قبر ہی قبر ہے۔ مسلمانوں نے اکثر فنون لطیفہ اپنے اوپر حرام کر رکھے تھے اس لیے ان کی جمالیاتی حس کو تسکین کی ایک ہی راہ ملتی تھی خوبصورت عمارتیں تعمیر کرنا پھر انھیں تراش خراش کر کے ان پر نقش و نگار سجا دینا جیسے فن کار اپنے فن کے ذریعے امر ہونا چاہتا ہے اسی طرح یہ حکمران اپنا مقبرہ بنا کر زندہ رہنا چاہتے تھے۔ یوں فاطمہ حسن اپنی تحریروں کے ذریعے معاشرے کے متنوع خیالات کو پیش کرتی ہیں۔ جیسے ان کی کہانی " چوتھے کونے کا آسیب" ہے جس میں جھوٹے لوگوں کو بے نقاب کرنے کی ایک عمدہ کوشش کی گئی ہے یہی آسیب مختلف انسانی روپ میں متشکل ہو کر ہر عورت کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ فاطمہ حسن اپنے عہد کے سماجی شعور سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اپنے عہد کی عورتوں کو ان آسیبوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں۔ یہ چار آسیب کبھی مہربان کبھی فقیر کے روپ میں سامنے آتے ہیں فاطمہ حسن چوتھے کونے میں موجود مکار لوگوں کے آسیب سے آگاہ کر رہی ہیں اس کہانی میں انھوں نے ہر راز افشا کر دیا ہے کسی بھی صورت میں ان لوگوں کو قابل اعتبار نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ سماجی سطح پر یہ لوگ دوسروں کی ذات کا نقصان کرتے ہیں۔

سیاسی، سماجی تغیرات انفرادی سطح پر فرد کے رویوں میں تبدیلی کا باعث بنتے ہیں اور انہی انفرادی رویوں سے اجتماعی رویے متشکل ہوتے ہیں اور سماج کی ایک صورت سامنے آتی ہے۔ عصر حاضر میں ملکی سیاسی و معاشرتی صورت حال کا مشاہدہ کیا جائے تو ہمارے ہاں سیاسی عدم استحکام اور بڑھتی معاشی بدحالی ہمارے انفرادی رویوں پر سب سے

زیادہ اثر انداز ہوئی ہے۔ قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک ہمیں کبھی سیاسی استحکام نہیں ملا اور نہ ہم نے معاشی طور پر خوش حالی کا دور دیکھا۔ غربت نے ہمیشہ ہمارے سماج کی اکثریت آبادی کو اپنے جال میں جکڑے رکھا اس تمام صورت حال سے ہمارے ہاں صرف بے یقینی، خوف، بے زاری اور عدم اعتماد جیسے رویے ہی تشکیل پا سکتے ہیں۔ اسی جانب فاطمہ حسن نے نشاندہی کی ہے۔

فاطمہ حسن کا تعلق کراچی سے ہے اس لیے ان کی تحریروں میں کراچی کے سماجی و معاشی مسائل کی پیش کش بہت زیادہ ملتی ہے۔ دورِ حاضر میں ہمارا سب سے بڑا قومی مسئلہ بدامنی اور انتشار ہے۔ دہشت گردی کے ناسور نے ہمارے معاشرے کو بری طرح لپیٹ میں لے رکھا ہے اور ملکی سطح پر قیامِ امن ایک بڑا سوال ہے۔ ان کی ایک کہانی "تم کو رقم کریں گے" کراچی کے موجودہ حالات و واقعات سے متعلق ہے۔(۸) کراچی میں ڈکیتی، چوری، قتل و غارت بالکل عام اور معمولی بات سمجھی جاتی ہے اور اب تو ایسی وارداتوں میں خطرناک حد تک اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ حالیہ عصری صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو پاکستان میں دہشت گردی اور بدامنی کے عفریت کا قبضہ نظر آتا ہے اور یہ بدامنی صرف دہشت گردی کے ساتھ مشروط نہیں بلکہ ہمارے ہاں اس کی دیگر کئی صورتیں ہیں۔ فاطمہ حسن نے اپنے عہد کے اس سماجی مسئلے کو اس کہانی کا بنیادی موضوع بنایا ہے کہ ڈکیتی اور چوری جیسے واقعات بچوں کی نفسیات پر کیا اثرات مرتب کر رہے ہیں کہانی ایک عورت کے گرد گھومتی ہے جس کے گھر چوری ہو جاتی ہے اور چور بہت سارا قیمتی ساز و سامان لوٹنے کے ساتھ ساتھ کہانی کی راوی عورت کی چند خوبصورت قلم بھی چرا کر لے جاتے ہیں۔ لہٰذا ان بچوں کو ڈاکوؤں سے ایک خاص طرح کی نفرت ہو جاتی ہے اور وہ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ان ڈاکوؤں کی وجہ سے ان بچوں کا مستقبل خراب ہوا اور نئے نئے خدشات میں گھر گئے۔ فی زمانہ یہ کہانی صرف کراچی ہی نہیں پورے پاکستان کے سماجی مسائل کی عکاسی کر رہی ہے۔

فاطمہ حسن کی رپورتاژ "میلے میں گم" ان کے گہرے سماجی اور سیاسی شعور کی عکاس ہے۔ اس رپورتاژ کا آغاز ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

وہ "عالمی ہے میلے" (International Hay Festival) میں گم ہو گئی۔(۹)

انھوں نے آگے چل کر مزید تفصیل میں لکھا ہے کہ ڈھاکہ کے شاہ جلال انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر "ہے فیسٹیول" میں شرکت کے لیے آنے والی ڈاکٹر فاطمہ حسن نے جب اپنے ماموں زاد بھائی کی آواز سنی "انیس آپا!" تو وہ فاطمہ حسن سے بچھڑ گئی۔ وہ وہاں پر غیر ملکی مندوب تھی اور اپنی شاعری سنانے آئی تھی مگر وہ کہاں تھی، پوری فیسٹیول کے دوران بس وہ کبھی کبھی خواب جیسی کیفیت سے باہر آتی اور مندوبانہ شناخت کے ساتھ اسٹیج پر جاتی ایسا اس وقت ہوتا جب اسے ڈاکٹر فاطمہ حسن کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ (۱۰)

فاطمہ حسن کا یہ رپورتاژ ظاہر کرتا ہے کہ انھیں اردو ادب سے شدید لگاؤ ہے وہ اپنی زبان کو اہمیت دیتی ہیں ان کی تحریروں میں زبان و ادب کی معاصر صورت حال بھی سامنے آتی ہے۔ اپنے سماج اور ثقافت کو ان کے نزدیک ہر چیز پر تقدیم حاصل ہے وہ کہتی ہیں کہ ان کی توقع کیا ہے؟ میں ان سے ایک تیسری زبان انگریزی میں گفتگو کروں؟ میں تو اردو اور بنگلہ بولوں گی۔ فاطمہ حسن کو اپنی دھرتی سے پیار ہے اسی لیے وہ کہتی ہیں کہ سنو لوگو! میں جس دھرتی سے آئی ہوں، وہاں ایک صوفی سچل سرمست شاعر ہفت زبان تھا۔ شاعر اور صوفی کسی مقام اور زبان میں قید نہیں ہوتے۔ سچل سرمست، امیر خسرو، رومی، حافظ ان کے مداح ٹیگور، نذرل، بیدل، غالب سب کا پیغام محبت تھا۔ (۱۱)

اس رپورتاژ میں فاطمہ حسن کا گہرا سیاسی شعور بھی سامنے آتا ہے۔ مثلاً جسٹس محمد ابراہیم کا تعارف کراتے ہوئے کہتی ہیں یہ وہی جسٹس محمد ابراہیم ہیں جنھوں نے ۱۹۶۲ء میں ایوب خان کے دستور سے اختلاف کرتے ہوئے مرکزی وزارت قانون سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اور استعفیٰ دے کر ڈھاکہ آگئے تھے فاطمہ حسن کہتی ہیں کہ مجھے ایک ملاقات میں جب میری ممانی ڈاکٹر صوفیہ احمد بھی ساتھ تھیں سید ہاشم رضا نے بتایا تھا کہ وہ اور ذوالفقار علی بھٹو استعفیٰ واپس لینے کے لیے ایوب خان کا پیغام لے کر جسٹس ابراہیم کے گھر پر انا پلٹن گئے تھے مگر انھوں نے انکار کر دیا، کیوں انکار کیا تھا۔ آپ اس دستور کو پڑھ لیجیے اور حال ہی میں شائع ہونے والی جسٹس محمد ابراہیم کی ڈائری کو جسے ڈاکٹر صوفیہ احمد نے مرتب کیا ہے تو پتا چل جائے گا کہ بیوروکریسی کے بڑے بڑے نام کتنے کوتاہ بین تھے جن کے پاس یا تو خلوص نہیں تھا یا بصیرت نہیں تھی۔ یا شاید دونوں ہی نہیں تھے۔ (۱۲)

فاطمہ حسن کے ہاں پاکستانی معاشرے کی سیاسی و سماجی صورت حال کی عکاسی نہایت دردناک انداز میں ملتی ہے۔ ان کی تحریروں میں اپنے سماج کی خامیوں کو دیکھنے، پرکھنے اور ان خامیوں کا حل بھی کہیں کہیں ملتا ہے انھوں نے اپنے

پاکستانی سماج کو نہایت باریک بینی سے تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے "میلے میں گم" میں لکھا ہے کہ تاریخ اچھے اور برے لوگوں سے بھری پڑی ہے حالات کو انتقام کی راہ پر ڈال کر ہم برائی کو پروان چڑھاتے ہیں۔ نفرت کے الاؤ میں انسانوں کا ایندھن استعمال کرنے والوں میں اہل قلم کو شامل نہیں ہونا چاہیے۔ تشدد اور دہشت گردی کے مقابل تو اہل دانش ہی ڈٹ کر کھڑے ہوتے ہیں کیوں کہ وہ دور تک دیکھ رہے ہوتے اور آنے والی نسلوں کا مستقبل ان کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے ہر وہ تعصب جو ماحول کو آلودہ کر کے بصارت اور بصیرت کے درمیان حائل ہو جائے اہل دانش اس سے پاک ہوتے ہیں۔ کاش ہمارے سیاست دان ان کی بینائی کا سہارا لے لیتے۔ مگر انھیں تو صرف اپنی ذات اور اپنی ناک تک ہی دیکھنا ہے یہی المیہ ہماری اور سب کی تباہی کی وجہ ہے۔ اپنے شہر کراچی کی صورت حال کے بارے میں فاطمہ حسن نے متعدد جگہ لکھا ہے یہاں بھی اسی صورت حال کو موضوع بناتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ وہ پوچھتے ہیں کیا آپ کراچی میں محفوظ ہیں؟ میں کہتی ہوں اس وقت دنیا میں کہیں بھی کیا کوئی محفوظ ہے؟ہاں! پاکستان دہشت گردی کی زد میں ہے لیکن خود میرے اپنے شہر کراچی میں اس وقت ادب اور آرٹ کی سرگرمیاں پہلے سے کہیں زیادہ ہیں۔ (۱۳)

فاطمہ حسن کے ہاں صرف مقامی صورت حال کی عکاسی نہیں ملتی کہیں کہیں ان کے ہاں عالمی سطح پر سماجی واقعات کے ذریعے عوام کو واقعات کی تفصیل بھی مہیا کی جاتی ہے مثلاً ان کا رپورتاژ " آدھا گاؤں میں محرم " انڈیا میں محرم الحرام کی تقریبات کے حوالے سے لکھا گیا ہے اور وہاں کی سماجی صورت حال اور محرم کے حوالے ان کی ثقافت کو ظاہر کرتا ہے وہ کہتی ہیں کہ تعزیے ہندو، مسلمان سب کے ہوتے ہیں۔ ان میں ذات برادری، فرقے کی تخصیص بھی نہیں صرف ایک مرکزی امام باڑے کو یہ حیثیت حاصل ہے کہ تمام تعزیے اپنے اپنے چوک پہ رکھنے سے پہلے وہاں لائے جاتے ہیں اور مرکزی تعزیے سے ملائے جاتے ہیں یہ رسم بھی بڑے اہتمام سے ادا ہوتی ہے۔ آٹھویں محرم کی رات کو مرکزی امام باڑے کے سامنے چوک پہ تعزیہ رکھ دیا جاتا ہے بڑے بڑے علم بھی چوک کے قریب ایستادہ کر دیے جاتے ہیں۔ (۱۴)

فاطمہ حسن مزید محرم کے حوالے سے تفصیل دیتے ہوئے لکھتی ہیں کہ غازی پور کے گاؤں میں عزاداری کی تمام جزئیات موجود ہیں مثلاً حد سے زیادہ دکھاوا، آپس میں مقابلہ اور رشک وحسد کے جذبات۔ مقابلہ دو محلوں میں اسی

طرح ہوتا ہے جنوبی اور شمالی پٹی کے میر صاحبان رشتے دار بھی ہیں دونوں میں برادری بھی قائم ہے اور دشمنیاں بھی۔ ایک دوسرے کے ہاں رشتے بھی کرتے ہیں اور قاتلانہ حملے بھی مگر پولیس کیس نہیں بناتے اپنے جھگڑے خود نمٹاتے ہیں دونوں طرف سے لوگ مجلسوں اور جلوسوں میں شریک ہوتے ہیں بس رویے سے اندزہ ہوتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ رشک اور حسد کے یہ نظارے آج بھی محرم میں نظر آتے ہیں بس تبدیلی یہ آئی ہے کہ لڑکیوں کے نوحے اور مرثیے اب ہندی رسم الخط میں لکھے ہوتے ہیں۔ ان میں پردہ بھی ویسا نہیں رہا جیسا پہلے تھا۔ تعلیم میں بھی وہ شہر کی لڑکیوں سے پیچھے نہیں۔ یوں فاطمہ حسن اس پوری صورت حال کی عکاسی اس رپورتاژ میں کرتی نظر آتی ہیں۔(۱۵)

فاطمہ حسن کے ہاں سماجی اور معاشرتی صورت حال پر رد عمل کا اظہار ان کے اداریوں میں بھی ملتا ہے۔ فاطمہ حسن ماہنامہ قومی زبان کی مدیر رہی ہیں۔ ان کے اداریے ان کے رد عمل کی مختلف صورتیں ہیں۔ سماج کا اثر ادب پر ہوتا ہے اور ادب ہر صورت معاشرے کو متاثر کرتا ہے۔ اور ایک ادبی جریدہ جو کہ متنوع موضوعات پر مشتمل تنقیدی، تخلیقی و تحقیقی تحریروں کا خوب صورت اظہار ہوتا ہے اس میں بیک وقت قاری کو تمام اصنافِ ادب تک رسائی میسر آ جاتی ہے۔ چنانچہ ادبی رسائل کے لیے ضروری ہے کہ وہ ادب کو صرف معاشرے کا آئینہ دار ہی نہ بنائیں بلکہ معاشرے کی اصلاح کی ذمہ داری بھی اٹھائیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ادیب ان تمام مضمرات سے آگاہ ہو، جو معاشرتی برائیوں کا سبب بن رہے ہیں، ان کی نشاندہی بھی ادیب کا فرض ہے۔ ایسی صورت میں تخلیق ہونے والا ادب ہی حقیقی معنوں میں تنقیدِ عصر کا فریضہ سر انجام دے گا۔ فاطمہ حسن نے بھی یہی فریضہ سر انجام دیا۔

مثلاً وہ اپنے اداریے "نہ سمجھو گے تو۔۔۔" میں علامہ اقبال کی خودی کے تصور کو معاشرے کے لیے ناگزیر تصور کرتی ہیں وہ سمجھتی ہیں کہ معاشرہ اقبال کے خیالات پر چل کر ہی کامیاب ہو سکتا ہے ان کے نزدیک نومبر کے مہینے میں علامہ اقبال کو یاد کرتے ہوئے ان کی ذات اور تخلیقات کے آئینے میں ہمیں اپنے ذاتی اور قومی کردار کا عکس بھی دیکھ لینا چاہیے۔ اقبال کا خواب، خودی، شاہین، مرد مومن جیسے الفاظ دہراتے اور رٹاتے اساتذہ۔ اور ان کے اشعار کو نعرہ بناتے پرجوش مقررین ایک مرتبہ ان کی فکر کی جہات پر غور کر لیں تو اقبال کی وسعت فکر کو نظر انداز کر کے رسمی طور پر یاد کرنے کے رویوں کو ترک کر دیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ

ارتکاز ذہنی کے ساتھ ان کی تخلیقات کے بحر بے کراں سے فکر

کا ایسا موتی نکالنا جو گوہر آب دار ہو، کمال شناوری چاہتا ہے۔(۱۶)

فاطمہ حسن کے بقول طلبہ کو ذہن نشین کرادیا جاتا ہے کہ اقبال نے اچانک ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر پاکستان کی شکل میں پوری قوم کو مل گئی۔ کتنی آسان سی بات ہے اس خواب کو دیکھنے والے کے اندیشوں اور اس کرب کو کبھی نہیں بتایا گیا جو شعور و آگہی نے اسے بخشا تھا جسے وہ عہد طفلی سے سہتے رہے۔انھوں نے اقبال کی شاعری کی مختلف جہات کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال کی شاعری اردو زبان کو فکر و اظہار کی بلندی تک لے کے گئی۔

فاطمہ حسن اپنے اس اداریے میں موجودہ سماجی صورت حال پر سوال اٹھاتے ہوئے کہتی ہیں کہ اقبال کے خواب اور تعبیر کے مراحل میں آنے والے ان تفکرات واندیشوں کو جس کا وہ مسلسل اظہار کرتے رہے۔ نظر انداز نہیں کیا گیا ؟بحیثیت قوم مسائل سے دوچار رہنا ہمارا مقدر کیوں بنا دیا گیا؟ اسی لیے فاطمہ حسن اس اداریے میں قوم کی سماجی حالت کو بہتر بنانے کا درس دیتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ اب بھی ہم نے ایسے حالات نہ پیدا کیے کہ شعور و فکر کے دریچے وا ہوں، علم و آگہی کی میراث اگلی نسلوں کو منتقل ہو، خودی اور خودداری کی لہر جاگے، ربط ملت پہلی ترجیح ہو اور مستقبل کا لائحہ عمل حقائق کی روشنی میں طے کیا جائے تو پھر اقبال کا خواب پورا کر سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ فاطمہ حسن معاشرے کی عمدہ نقیب ہیں جس کا ایک ثبوت ان کے یہ سیاسی وسماجی اداریے ہیں جو عصری صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ ہمارا معاشرہ اسی وقت ترقی کرے گا جب عوام پڑھی لکھی ہو گی اس حوالے سے وہ اپنے اداریے میں لکھتی ہیں کہ

اب جب کہ سال ۲۰۱۹ء کا اختتام ہو رہا ہے نئے سال میں داخلے سے پہلے

قومی پالیسی بنانے والوں کو تعلیم و ثقافت کے شعبے میں کارگزاری پر ناقدانہ

نظر ڈالنی چاہیے۔(۱۷)

فاطمہ حسن کے بقول صاحبان اختیار کے ساتھ ہر فرد کو اس بات کا ادراک ہونا چاہیے کہ علمی ترقی کے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں اور ثقافتی شناخت ہی قومی شناخت کی بنیاد ہے۔اس وقت صرف اکابرین کو یاد کرنے سے قوم کا مستقبل نہیں

بن سکتا بلکہ ان اکابرین کے فکری اثاثے کو اگلی نسل تک منتقل بھی کرنا ہے۔ تاکہ پاکستانی قوم کا مستقبل بہتر ہو سکے ۔فاطمہ حسن کے یہاں پاکستانی سماج کو بہتر بنانے کے لیے کئی طرح کی کوششیں نظر آتی ہیں۔

اگرچہ کسی بھی رسالے یا جریدے کے اداریے کا باقاعدہ اور مبسوط مقالہ نہیں ہوتا مگر یہ ادب پر تنقید کے مضمون کی حیثیت بہر حال رکھتا ہے۔ یہ اپنے عہد کے اہم ترین مسائل کو استعاراتی انداز میں قارئین کے سامنے لاتا ہے اور انھیں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ ان اداریوں میں کہیں کہیں ملکی و قومی مسائل اور بین الاقوامی حالات وواقعات کی روشنی میں خبروں کا اور واقعات کا بھرپور تجزیہ کیا جاتا ہے اور کہیں ان اداریوں کی نوعیت علمی وفکری مضامین کی سی ہو جاتی ہے۔ ادب میں کون سے نئے رجحانات پروان چڑھ رہے ہیں ان کی نشاندہی بھی اداریوں میں ہوتی ہے۔ لیکن کسی بھی موضوع کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے جو تجزیہ یا تبصرہ کیا جاتا ہے اس میں مدیر اپنی رائے قارئین پر لاگو نہیں کرتا بلکہ قاری خود اس کی تائید وتردید کا فیصلہ کرتا ہے اور یہی آرا ادیبوں کے لیے بھی راہنمائی کا کام سرانجام دیتی ہیں۔

فاطمہ حسن موجودہ سیاسی نظام میں عوام اور حکمران کی دوریوں کو موضوعِ بحث بناتی ہیں ان کے نزدیک عوام اور حکمران میں فاصلہ نہیں ہونا چاہیے۔ماہنامہ "قومی زبان" کے جون ۲۰۱۹ء کے اداریے میں وہ قومی زبان کی اہمیت اور حکمرانوں کی پالیسیوں کو موضوع بناتے ہوئے کہتی ہیں کہ اعلیٰ ملازمتوں کے امتحانات اردو زبان میں لیے جانے سے متعلق پاکستان کی سینیٹ قرارداد کی منظوری ایک مستحسن پیش رفت ہے۔ اگر اس عمل درآمد میں رکاوٹ نہ ڈالی گئی تو عوامی خدمت کے سرکاری اداروں میں بہتری پیدا ہو سکتی ہے جس کا ذہین اور دانش مند افراد کی غیر موجودگی کی وجہ سے فقدان رہا ہے۔ عوام سے وہ فاصلے بھی ختم ہوں گے جو خدمت کے بجائے حاکمیت کے رویے نے پیدا کیے ہیں۔ اعلیٰ سرکاری افسران سمیت تمام سرکاری ملازمین کی تنخواہ و مراعات کے بھاری اخراجات عوام کے ادا کردہ ٹیکس سے ہی پورے کیے جاتے ہیں۔ اس کے عوض عوامی حقوق کی ادائیگی ان سرکاری ملازمین کا بنیادی فرض ہے۔ سرکاری ملازمت میں داخل ہوتے ہوئے انھیں احساس ہونا چاہیے کہ ان کی تقرری عوامی خدمات کی بجا آوری کے لیے ہوئی ہے نہ کہ عوام پر حاکمیت کے لیے ہوئی ہے۔(۱۸) فاطمہ حسن نے جارحانہ لب ولہجہ اور اسلوب اختیار کیا ہے ان کا یہ اداریہ عوام کے جذبات کا عمدہ ترجمان ہے۔

فاطمہ حسن موجودہ پاکستانی سماج میں سیاست کے عمل دخل اور اس کے کردار کو موضوع بناتے ہوئے کہتی ہیں کہ سول سرونٹس خادم کی بجائے حاکم بنے رہے اور ان کی کوشش رہی کہ عام لوگ ان کی سطح پر نہ آسکیں اس لیے سرکاری اسکول، اور دیگر تعلیم گاہیں جہاں سے ماضی میں نابغۂ روزگار ہستیاں نکلیں، ان کے نظام کو کمزور کر کے تعلیم کو بھی تجارت بنادیا ایسی تجارت جس میں منافع ہی منافع ہو۔ تعلیم کے شعبے کو طبقات میں تقسیم کرنے والے دانش و بصیرت کی کس سطح پر تھے اس کا اندازہ موجودہ شرح خواندگی سے لگایا جاسکتا ہے۔ جہاں علم کا معیار انگریزی پر دسترس اور غیر زبان میں ڈگری حاصل کرنا مقصد ہو وہاں دانش کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ فاطمہ حسن کا اسلوب اس ادارے میں ایسا تند ہے کہ وہ قاری کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں کہ غیر زبان میں ڈگری حاصل کرنے کے لیے اس زبان و ثقافت کو تج دینا جو ہمارے خطے کے عوام کی پروردہ ہے کہاں کی دانش مندی ہے دانش و بصیرت جس مطالعے اور مشاہدے سے ممکن ہے وہ بر آمد اور ملاوٹ شدہ تعلیم سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کا حصول اس اجتماعی دانش کا حصہ بن کر ممکن ہے جو صدیوں میں ایک خطے میں پروان چڑھتی ہے۔ اور یہ دانش اپنی زبان و ثقافت سے وابستگی چاہتی ہے اس لیے موجودہ عوام کو اپنی بہتری سوچنی چاہیے۔ فاطمہ حسن یہی بتانا چاہتی ہیں کہ قومی ارتقا کے لیے اپنی زبان میں تعلیم کا حصول از حد ضوروی ہے۔

فاطمہ حسن سماجی صورت حال کا جائزہ تعلیمی بنیادوں پر پیش کرتی ہیں ان کا مشاہدہ وسیع ہے وہ کہتی ہیں کہ ہمارے یہاں خاندانی نظام باقی ہے۔ بچوں کو والدین اور بزرگوں کی زبان سے محروم کر کے پورے نظام کو تہ و بالا کرنے والے تعلیمی ادارے جس طبقاتی فاصلے کو بڑھا رہے ہیں وہ قومی مفاد میں بالکل بھی نہیں۔ فاطمہ حسن کہتی ہیں۔

> ہمیں ایک قوم بننے کے لیے اپنی مشترکہ روایات، اقدار اور زبان کے ساتھ وابستہ رہنا چاہیے تھا اس سے روگردانی نے اب تک بہت نقصان پہنچایا ہے۔(۱۹)

فاطمہ حسن نے درست سمت کی نشاندہی کرتے ہوئے پاکستانی سماج میں تعلیم کے ناقص نظام پر گہری تنقید کی ہے کہ ہمارے متوسط یا غریب طبقے کے ذہین بچوں کو صرف انگریزی کے لہجے سے ناواقفیت کی بنا پر احساس کم تری میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور ان سے کم تر ذہن رکھنے والے بڑی بڑی فیسیں ادا کر کے اور روایات سے ناتا توڑ کر پاکستانی ثقافت اور پاکستانیت سے دور ہوتے گئے ہیں اس سے پاکستانی قومیت کا تصور دو سطحوں پر کمزور ہوا ہے پہلی سطح وقار کی ہے اور

دوسری سطح ذہنی صلاحیت کی ہے۔ فاطمہ حسن کہتی ہیں کہ اس سماجی اور طبقاتی کش مکش سے ہمیں جو نقصان پہنچنا تھا وہ پہنچ چکا ہے اب سنبھلنے کا وقت ہے اور ہمیں اپنی ملکی شناخت اور قومی سلامتی کے متعلق بر وقت فیصلہ کرنا ہو گا تا کہ ہم ترقی کر سکیں۔

اداریہ مدیر کی شخصیت کا پرتو اور رسالے کی پالیسی کا ترجمان ہوتا ہے کیونکہ اس کا کام ادب اور ثقافت کو تشکیل دینے والوں اور لکھنے والوں کی درست راہنمائی کرنا اور تخلیق کاروں کے اذہان کو اصل سمت دکھانا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اداریہ نویس اداریوں میں علمی و فکری گفتگو سے پڑھنے والوں کے لیے سوچ کے نئے در وا کرتا ہے اور کبھی کبھی ایسے موضوع پر اظہارِ خیال کرتا ہے کہ جو عام آدمی کے ذہن میں کبھی بھی نہ آیا ہو یا وہ اس موضوع اور مسئلے پر اس گہرائی سے نہ سوچتا ہو۔ یوں مدیر کی آرا پڑھنے والوں کو علم و ادب کی نئی جہات دکھاتی ہے جو مختلف ادبی و فکری موضوعات کو زیرِ بحث لا کر قارئین کو ادبی شعور عطا کرتا ہے۔ فاطمہ حسن بھی اپنی تحریروں میں قاری کو نئی سمت دکھاتی ہیں۔

فاطمہ حسن نے پاکستانی سماج کی مختلف برائیوں اور متنوع جہات کو بے نقاب کیا ہے۔ جنوری ۲۰۱۹ء کے اداریے میں لکھتی ہیں کہ یہ سال بھی شروع ہو گیا۔ اب پاکستانی قوم کو اپنی ترجیحات سماج کے حوالے سے ترتیب دینی چاہیے۔ ہمیں اپنی ترجیحات پر نظر ڈالنی چاہیے۔ بحیثیت قوم ہمارے سفر نے کس رخ اور کن مقامات تک رسائی حاصل کی۔ فاطمہ حسن پاکستانی قوم کو سوچنے کے نئے زاویے عطا کرتی ہیں کہ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم معیشت میں ایک سال میں کتنا آگے بڑھے ہیں؟ کتنا سیاسی استحکام حاصل کیا؟ تعلیم کے میدان میں کیا پیش رفت ہوئی؟ ادب و ثقافت کے میدان میں نیا پن کیا آیا؟ کیونکہ قومیں اپنے ادب، فنون اور ثقافت سے پہچانی جاتی ہیں۔ معیشت اور دفاع انھی کی حفاظت کے لیے ہوتے ہیں یہ حقیقت اربابِ اختیار کے پیشِ نظر ہو تو انھیں بھی اپنی ترجیحات طے کرنے میں آسانی ہو گی اور دیگر کامیابیوں کے ساتھ ایک مہذب قوم کا مقام بھی حاصل ہو سکے گا تعلیم اس کامیابی کی طرف پہلا پڑاؤ ہے۔ ایک طرح سے تعلیم آغاز سفر بھی ہے کہ یہی ارتقا کی بنیاد ہے۔ (۲۰)

معاشرہ مسلسل تغیر پذیر رہتا ہے اور تبدیلی و انقلاب اس کے لیے ضروری ہیں۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں کئی قسم کے سماجی و سیاسی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی اپنے ساتھ نئے مسائل لے کر آتی ہے۔ اس لیے ان مسائل کو سمجھنے

کے لیے ایسے ذہن وفکر کی ضرورت ہوتی ہے جو ان جدید مسائل کا احاطہ کر سکے اور ان کی نشاندہی کر سکے۔ یہی سیاسی وسماجی تبدیلی ادب کی اصناف کو بھی متاثر کرتی ہے اور اس میں بھی کئی قسم کے نئے موضوعات ومسائل کو پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ فاطمہ حسن پاکستانی سماج کے بہت سے مسائل کو اپنے اداریوں کا موضوع بناتی ہیں۔

فاطمہ حسن قوم کی ترقی کی بنیاد تعلیم کو قرار دیتی ہیں اور اس کے حصول کے لیے کسی منصوبہ بندی کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ بھی دیتی ہیں کہ تعلیم کی ابتدا مضبوط قدموں اور پائیدار منصوبہ بندی سے ہونی چاہیے۔ تعلیم صرف حصول روزگار کی دوڑ میں شامل ہونے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ ارتقائے انسانی کی اہم کڑی بھی ہے۔ یہ ارتقا اسی وقت ممکن ہے جب علم کے ساتھ دانش پیدا کرنے کی بھی صورت ہو یہ صورت گری کرنے والے نایاب ہوتے ہیں جن کی طرف فاطمہ حسن نے اشارہ کیا ہے۔ ان نایاب لوگوں کو سامنے لانا حکومت وقت کی ذمہ داری ہے جو پوری دیانت سے ادا ہونی چاہیے۔

زبان کو سماج میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ زبان کے حوالے سے فاطمہ حسن کے کئی اداریے ملتے ہیں پاکستان میں اردو کو سرکاری سطح پر کوئی اہمیت نہیں مل سکی ۲۰۱۵ میں عدالتی سطح پر پاکستان کی قومی زبان اردو کے حوالے سے فیصلہ کیا گیا۔ فاطمہ حسن اکتوبر ۲۰۱۵ء کے اداریے میں لکھتی ہیں کہ اس فیصلے کے بعد سرکاری اداروں میں مراسلت اردو زبان میں کی جائے؟ ایک حلقے سے یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ کیا ایسا کرنے کے لیے تیاریاں کی گئی ہیں؟ اول تو یہ سوال ہی بڑا ستم ظریفانہ ہے کہ جس زبان میں عوام کی اکثریت ابلاغ کر رہی ہے اس میں سرکاری اداروں کو دشواری ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مقتدرہ قومی زبان جو اب ادارۂ فروغ قومی زبان ہے وہ اسی مقصد کے لیے قائم کیا گیا تھا ۔مقتدرہ نے یہ کام انجام دیا تھا کہ وہ اردو میں دفتر کی مراسلت کے لیے ضروری مواد تیار کرے۔ مگر کیا کیا جائے کہ کراچی جیسے شہر میں اس ادارے کی کتب دستیاب نہیں ہیں اس حوالے سے فاطمہ حسن نے ببانگ دہل اس نظام کی خرابیوں کو بیان کیا ہے ان کے نزدیک یہ دانستہ اور نادانستہ دونوں طرح سے کوششیں کی گئی ہیں کہ اداروں کے ذریعے اردو کو کمزور کیا جائے۔(۲۱)

فاطمہ حسن کے نزدیک یہ نظام درست کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اردو زبان کے نفاذ کی عملی کوشش کی جائے کیونکہ یہ عصر حاضر کا تقاضا ہے کہ اپنی شناخت اپنی زبان کے ذریعے قائم کی جائے وہ لکھتی ہیں کہ اس حوالے سے کراچی میں کچھ تھوڑی بہت کاوش نظر بھی آتی ہے جیسے کہ مقتدرہ کی کتب کے لیے ایک دکان جو اردو لغت بورڈ کے ایک کمرے میں کھولی گئی تین سال سے باقاعدہ تالے پر سیل لگا کر بند پڑی ہے۔ جانے اندر ان کتابوں کا کیا حال

ہے۔ ادارے ایسی صورت حال سے نہ جانے کیوں چشم پوشی اختیار کرتے ہیں؟ فاطمہ حسن ایسے نظام پر سوالیہ نشان لگادیتی ہیں۔

فاطمہ حسن موجودہ پاکستان کے سیاسی وسماجی مسائل کو تعلیم کی کمی کا شاخسانہ قرار دیتی ہیں وہ کہتی ہیں کہ نویں جماعت سے بی اے کے مطالعہ پاکستان کے نصاب میں طلباء کو بار بار دو قومی نظریہ پڑھایا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ جب انگریز حکومت نے ہندی کو سرکاری زبان کے طور پر عدالتوں اور سرکاری اداروں کی زبان بنانے کا فیصلہ کیا تو مسلمانوں نے اسے اپنے تشخص پر حملہ جانا اور اردو کو اپنی قومی زبان قرار دیا اس طرح یہ واضح کیا گیا کہ زبان کسی قوم کی ثقافت کی آئینہدار ہوتی ہے اور برصغیر کی مسلم ثقافت کی مظہر اردو زبان ہے اور یہ بات سرسید اور اقبال کے پیش کردہ نظریے میں پوری طرح واضح تھی تو کیا اب وہ نظریہ نہیں رہا یا قوم نہیں رہی خدا کا شکر ہے کہ بہت سی غلطیوں اور ارباب اقتدار کی کتابی پالیسیوں کے باوجود اردو زبان اور اس سے منسلک ہمارا قومیتشخص قائم ہے البتہ اردو کے ساتھ جو منافقانہ طرز عمل جاری رہا اور پوری قوم کے ساتھ جو مذاق جاری رہا اس پر غور کریں تو ہم اس کرب کی انتہا پر پہنچ جاتے ہیں جہاں رونے کی جگہ ہنسی آتی ہے۔ فاطمہ حسن کے مطابق یہ ہم ہیں جو اس قوم کی ترقی اور تنزلی دونوں باتوں کے ذمہ دار ہیں۔

فاطمہ حسن کے یہاں سماجی اور سیاسی صورتحال کا ادراک عام ادیبوں کے برعکس نظر آتا ہے وہ اپنے ہم عصر ادیبوں کے بارے میں بھی اور ان کی سیاسی بصیرت کے بارے میں ایک گہرا شعور رکھتی ہیں مشتاق احمد یوسفی کے بارے میں لکھتی ہیں کہ مشتاق احمد یوسفی اس اعلیٰ تعلیمیافتہنسل کے چند آخری نمائندوں میں سے تھے جنھوں نے پاکستان کی جدوجہد آزادی کے بعد کے حالات سے گزر کر اس میں ادارہ سازی کی۔ بینکنگ کے شعبے میں اعلیٰ ترین انتظامی عہدے پر فائز رہے ملک اور بیرون ملک بینکوں کی شاخیں قائم کی تو اس میں نمایاں کردار ادا کیا یہ وہ دور تھا جب وطن عزیز کی ہر صبح کسی نئی پیشرفت کے ساتھ طلوع ہوتی تھیں انہوں نے مشرقی پاکستان میں بینکوں کی شاخوں پہ کھلنے کا ذکر بھی اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے پھر اسی مشرقی پاکستان کو جدا ہو کر بنگلہ دیش بنتی بھی دیکھا سیاستدانوں اور افسروں کی غاصبانہ فطرت کو برداشت کیا اور لکھا انھوں نے امیروں کو مزید امیر ہوتے اور غریبوں کو مزید غریب ہوتے دیکھا سماجی ناانصافی اور اہل علم کے بے وقار ہونے کا تماشا بھی ان کی نظر سے گزرا ان موضوعات اور اس ادبی بددیانتی کو بھی موضوع بنایا جو ادب اور ادیبوں کے وقار کے منافی ہے شاعر و ادیب کی تاج پوشی کی رسم بد ہو یا غیر شاعری کی داد اور شاعرات سازی۔ ایسی سرگرمیوں کو بھی بڑھاوا دینے سے روکنے کے لیے اپنا قلم استعمال کیا ان کا ایک امتیاز ساری دنیا میں لکھے جانے والے معاصر ادب کا مطالعہ اور اپنے وطن کے لکھنے والوں سے باخبر رہنا بھی تھا وہ

کبھی شہرت کے پیچھے نہیں کھلتی دشرت خود ان کے حق میں ملاقات کی صورت نکال لیتے۔ وہ سب سے ملتے تھے مگر بہت کم گھلتے ملتے تھے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ فاطمہ حسن نے اپنے اس اداریے میں مشتاق احمد یوسفی کی سماجی بصیرت کو عام قاری کے لیے پیش کیا تا کہ وہ ان کی زندگی سے مستفید ہو سکیں اور وہ خود بھی معاشرے کے فعال رکن بن جائیں۔

فاطمہ حسن ستمبر ۲۰۱۹ کے اداریے میں لکھتی ہیں کہ سماجی صورتحال کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی شناخت کو محفوظ رکھا جائے اس لیے کہ جو قومیں اپنی تاریخ اور ثقافتی شناخت پر ناز کرتی ہیں ان کی حفاظت کرتی ہیں۔ ان کی شناخت کا سفر محفوظ ہو کر تہذیب کی تاریخ بن انھیں معتبر بناتا ہے وہ کتابیں جو قدیم ترین ہیں وہ تحریر جو کہیں بھی موجود ہے تو تمدن کی نشاندہی کر رہی ہے اور انسانی تاریخ کا ایسا باب ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ پاکستانی سماج کو اپنے اس ورثے کی قدر کرنی ہو گی۔ آج بھی ترقی اردو پاکستان ایسے ہی ورثے سے مالا مال ہے قدیم کتابیں اور قدیم ترین مخطوطات انجمن کے پاس کتب خانے اور عقائد میں محفوظ ہیں ہمارا سرمایہ ہے یہ وہ قیمتی متاع ہے جو قیمت ادا کر کے حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ زبان و الفاظ کے قیمتی خزانے میں علم کے کیسے کیسے لعل و گوہر موجود ہیں ان کی قدر و قیمت کو تحقیق کرنے والے ہر دور میں سامنے لاتے رہیں گے یہ ہماری اجتماعی ذمہ داری ہونے کے ساتھ انفرادی فرض بھی ہے کہ ہم اپنی ثقافت کی اپنی ثقافت کو محفوظ رکھیں اور اس میں کہاں تک کامیاب ہیں یہ سوچتے رہنا چاہیے کہ قرآن قوم ترقی کی راہ پر گامزن نہیں رہ سکتی۔(۲۲) فاطمہ حسن ترقی کے لیے صدیوں پہلے سے ہندوستان میں موجود علمی ذخائر کی طرف مراجعت کی تلقین کرتی ہیں۔

فاطمہ حسن عصر حاضر میں قوم کے اندر کچھ اچھی صفات دیکھنے کی متمنی ہے اس لیے وہ چاہتی ہیں کہ معاشرے کے اندر تحمل اور بردباری پیدا ہو تا کہ ایک مہذب قوم کے فرد کی شخصیت بہتر انداز میں تعمیر ہو سکے اس مقصد کے حصول کے لیے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے والدین اساتذہ تعلیمی اداروں کے مالکان حکومتی اداروں کا کردار اس حوالے سے اہم ہے کہ پہلے تو خاندانی نظام مستحکم تھا تو بچوں کو بزرگوں کی جانب سے توجہ اور غیر رسمی تعلیم بھی میسر ہوتی تھی جو ذہنی وسعت عطا کرتی تھی اب جبکہ وہ بزرگ نہیں رہے والدین کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے اس سلسلے میں فاطمہ حسن موجودہ سماج کی خامیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتی ہیں کہ اب والدین کو اپنا کردار نبھانا ہو گا ورنہ معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔

فاطمہ حسن سماج کو بہتر بنانے کے لیے مشاہیر کے بڑے کارناموں کو بطور مثال پیش کرتی ہے انھیں مشاہیر میں ایک سچل سرمست بھی ہیں۔ جن کے متعلق فاطمہ حسن نے جولائی ۲۰۱۷ء کا اداریہ لکھا۔ وہ لکھتی ہیں کہ سچل کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ اپنی مادری زبان سندھی کے علاوہ اس خطے میں بولی جانے والی تمام زبانوں سے واقف تھے اور انہوں نے اپنی فکر کا برملا اظہار سندھی فارسی سرائیکی اور اردو زبان میں کیا ہے ان چار زبانوں میں آپ کی تصنیفات موجود ہیں۔ سندھی ان کی مادری زبان تھی فارسی خیر پور ریاست کی سرکاری زبان اوراردو ہندوستان کے صوفیا کرام کے بدولت پھل پھول رہی تھییہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے اس وقت جب سندھ میں اردو رائج نہیں تھی اور اس زبان کو دربار میں رسائی حاصل نہیں ہوئی تھی اس وقت اردو میں بہت متاثر کن شاعری کرنا حیرت انگیز ہے بہر حال یہ واقعہ ہے کہ سچل سندھ کے پہلے اور اپنے عہد کے واحد شاعر ہیں جنھوں نے برعظیم پاک وہند کے اپنے ہم عصر شعرا خصوصاولی دکنی کے انداز اور معیار کے مطابق ایسی شاعری کی ہے جو آج ڈھائی صدی کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اپنی اثر انگیزی اور معنویت کو قائم رکھے ہوئے ہے۔(۲۳)

فاطمہ حسن سچل سرمست کو بطور مثال پیش کرتی ہیں وہ لکھتی ہیں کہ سچل سرمست کا زمانہ وہ تھا جب انگریز سندھ میں پیش قدمی کر رہے تھے تجارت کے نام پر سندھ میں قدم جمانے کی کوششوں اور یہاں کے حکمرانوں کی عاقبت نا اندیشی کو سچل سرمست نے نہ صرف محسوس کیا بلکہ سے خبر دار بھی کیا کہ یہ قوم کے حق میں فائدہ مند نہیں۔ وقت نے ان کے اس مشاہدے کو درست ثابت کیا اس وقت بھی ہمارے خطے کے حالات بیرونی عناصر کی ریشہ دوانیوں اور اندرونی سازشوں کا شکار ہے اس وقت ہمیں اسی مرکزیت اور انسان دوستی پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے جس کا پیغام انھوں نے دیا تھا۔ سچل اپنے عہد کی خرابیوں کو دیکھ رہے تھے اور انسانیت کو اس کے مقام سے گرتے ہوئے شدت سے محسوس کر رہے تھے وہ طاقتوروں کے ان ہتھکنڈوں کو پہچان رہے تھے جو کمزوروں کو محکوم بنانے کے لیے استعمال ہو رہے تھے اور عام انسان میں اس کی خودی کو بیدار کرنا چاہتے تھے جو اس کو پستی سے نکلنے میں مدد دے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ عقیدت کے زبانی کلامی اظہار کے ساتھ ساتھ ان کے پیغام پر عمل پیرا ہونے کی آج کتنی ضرورت ہے اسی ضرورت کی طرف فاطمہ حسن ہماری قوم کو متوجہ کرنا چاہتی ہیں تاکہ ہم اپنے سماج کو بہتر بنا سکیں۔

فاطمہ حسن سچل سرمست کی تعلیمات کو عصر حاضر کا بنیادی تقاضا سمجھتی ہیں کہ سچا صوفی، عالم اور دانشور ہر طرح کی عصبیت سے پاک ہوتا ہے اور انسانیت کا علمبردار ہوتا ہے۔ جہاں وہ بے بانگ دہل کہتے ہیں کہ شیخ ملا پیر حکمران کو تفرقہ پھیلانے والا اور اس اکائی سے دور کرنے والا ہے جو خدا اور اس کے بندے کی ہے۔ سچل نے بھی ان کیتعلیمات کی نفی کی ہے۔ ان تمام صوفیاے کرام کا مسلک ہے کہ عصبیت اور تفرقہ بازی سے پاک ہو کر انسانیت کے ایسے بلند مقام پر پہنچا جائے جس کی دعوت حضرت سچل سرمست نے دی تھی جہاں خدا کی صفات اور اس کے بندے کے اوصاف یکساں ہو جائیں۔ دراصل فاطمہ انسان کو انسان بننے کا درس دیتی ہیں ہمارا سماج جو اب تفرقہ بازی میں ہے اور عہدے اور اونچ نیچ میں پڑا ہوا ہے وہ اس طبقاتی نظام کا خاتمہ چاہتی ہیں تا کہ ہمارا معاشرہ سدھر سکے۔ انسانیت کے جس مقام کی صوفیا کرام نشاندہی کرتے ہیں فاطمہ حسن کا کہنا ہے کہ یہی مقام عصر حاضر کا تقاضا ہے اور ان کی تعلیمات پر چلنا وقت کی اولیں ضرورت ہے۔

اسی طرح فاطمہ حسن عصر حاضر میں دوسری نابغۂ روزگار شخصیات سے بھی فیض حاصل کرنے کا درس دیتی ہیں۔ فروری ۲۰۱۹ء کے اداریے میں لکھتی ہیں کہ غالب سرسید اور اقبال کے فکر و فن کے روشن چراغ آج بھی ہماری رہنمائی کر رہے ہیں۔ اپنے آپ کو مستحکم کرنے کے لیے ان کی تحریروں کی جانب اپنی نسل کو متوجہ کرنا ہماری ذمہ داری ہے اس میں شاید ہم کامیاب نہیں ہیں۔ ابھی وقت ہے اب سنجیدگی سے اس جانب متوجہ ہوں اور اپنی زبان و ادب کو جو ہماری ثقافت کا مظہر ہے اپناتے ہوئے فخر محسوس کریں کہ انھوں نے ہمارے لیے جو اثاثہ چھوڑا ہے وہ ہمارے لیے کافی ہے۔ ذرا ان شخصیات کا تصور کیجیے جو صرف فن کار نہیں تھے اپنے فن کی قدر و قیمت سے بھی آگاہ تھے۔ غالب نے خود کو نام آور لکھا اور اعلان کیا کہ ان کا انداز بیان منفرد ہے۔ اقبال نے پوری شدت کے ساتھ بتایا کہ وہ اپنی خوش بیانی سے قوم کو وہ راہ کھانا چاہتے ہیں جن سے وہ بھٹک چکی ہے سرسید نے ابتدا میں تو غالب کیتنبیہہ کا برا مانا مگر بعد میں ان کے افکار کی روشنی سے ان کا مستقبل روشن ہو گیا اور پھر انہوں نے جدید علوم سے وابستگی کا جو رویہ اپنایا وہ مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا۔ (۲۴) ان تینوں شخصیات نے پاکستان میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک قیمتی اثاثہ چھوڑا ہے جس سے عصر حاضر میں استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

فاطمہ حسن موجودہ نوجوان نسل کو مل جل کر رہنے اور یکجہتی کا درس دیتی ہیں۔ مارچ ۲۰۱۸ء کے اداریے میں لکھتی ہیں کہ نوجوان نسل کو نظریۂ پاکستان اور قرارداد لاہور جسے اب قرارداد پاکستان کہتے ہیں، صرف نصاب کی ضرورت سمجھ کر نہیں۔ بلکہ اس کے پس منظر اور قومی شناخت کے سفر کی کٹھنائیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے پڑھانا چاہیے
۔نوجوانوں کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ قیام پاکستان کے بعد دشمنوں کا ہدف جغرافیائی سرحد سے زیادہ نظریاتی سرحدوں کی تباہی کی طرف رہا ہے۔ انھوں نے ایک قوم کو جو مذہب، ثقافت اور زبان کی بنیاد پر متحد ہوئی تھی۔ اسے منتشر کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا ہے۔ ان تینوں جہات میں تعصبات کے بیج ڈال کر ان کی آبیاری بڑے منظم طریقے سے کی گئی ہے۔ فاطمہ حسن کہتی ہیں کہ وہ واضح فکر جس کی بنیاد پر برعظیم کے مسلمانوں نے بے پناہ قربانیوں کے بعد ایک وطن حاصل کیا تھا کہیں دھندلی لکیر سی بنی بے بصیرت لوگوں کے قدموں تلے روندی جا رہی ہے۔ نظریۂ پاکستان اور پاکستان دونوں کی سرحدوں کی حفاظت میں ہم کتنا کامیاب ہوئے ہیں ہمیں سوچنا چاہیے۔ اسی فکر کی جانب فاطمہ حسن ہماری توجہ مبذول کرا رہی ہیں۔(۲۵)

فاطمہ حسن کی ایک پوری کتاب کتاب دوستاں مختلف مضامین پر مشتمل ہے۔ فاطمہ حسن نے اپنے مضامین میں سماج کو سدھارنے کی بات کی ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین مختلف شخصیات کے حوالے سے ہیں۔ فاطمہ حسن ان شخصیات کو معاشرے کا اہم فرد گردانتی ہیں اور ان کی زندگی کو بطور نمونہ پیش کرتی ہیں۔ بہ حیثیت نقاد اس کتاب میں ان کے چھبیس مضامین شامل ہیں۔ جن میں

۱۔ ڈاکٹر اسلم فرخی، نگارستان آزاد میں

۲۔ انور شعور، فرقۂ ملامتیہ

۳۔ اکبر معصوم کی شاعری، ذات اور کائنات کے رنگوں سے سجی

۴۔ بیدی کی کہانیوں میں عورت پرش اور پراکرتی

۵۔ پیرزادہ قاسم کی شاعری، خاموشی میں ابھرتی آواز

۶۔ جمال احسانی، عہد حاضر میں ایک اہم نام

۷۔ خالدہ حسین کا ناول کاغذی گھاٹ، ایک مطالعہ

۸۔ رضیہ فصیح احمد، آبلہ پا سے زخم تنہائی تک

۹۔ زاہدہ حنا کی تین جہتی کہانیاں

۱۰۔ زہرا نگاہ کی شاعری فراق میں

۱۱۔ شاہدہ حسن، ایک سچی شاعرہ

۱۲۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری کی کتاب بلوچ سماج میں عورت کا مقام، ایک مطالعہ

۱۳۔ شیخ ایاز اور رسالہ شاہ عبد اللطیف بھٹائی کا ترجمہ

۱۴۔ فراز، پرستش کی حد تک مقبول

۱۵۔ فراق، تخلیقات اور شخصیت

۱۶۔ فرحت پروین کی کہانیاں، منجمند سے کانچ کی چٹان تک

۱۷۔ فہمیدہ ریاض، ایک عہد کی شناخت

۱۸۔ فیض اور تنہائی

۱۹۔ کشور ناہید، نسائی شاعری کی پہلی مزاحمتی آواز

۲۰۔ قمر جمیل کی عصری آگہی اور چہار خواب

۲۱۔ لطف اللہ خان، ایک شخصیت سب سے الگ

۲۲۔ مبین مرزا کی کہانیاں۔ گمشدہ لوگ

۲۳۔ محبوب خزاں کی اکیلی بستیاں اور گہری اداسی

۲۴۔ مشتاق احمد یوسفی، کتاب بھر کے فاصلے پر

۲۵۔ منیر نیازی کی یاد میں

۲۶۔ منیر نیازی کا مجموعہ کلام۔ سفید دن کی ہوا۔ ایک مطالعہ

فاطمہ حسن ان مضامین کے بارے میں کہتی ہیں کہ

> کتاب دوستاں میں شامل مضامین لکھنے والوں کی شخصیات سے
> زیادہ ان کی تحریروں کا مطالعہ ہے یہ مضامین تقریباتی ضرورت

کے تحت نہیں لکھے گئے بلکہ مطالعے کی عادت نہیں لکھوائے ہیں
جو مضامین صرف تقریب کی رسم پوری کرنے کے لیے لکھے تھے
وہ ان میں شامل نہیں ان کے علاوہ متعدد مطالعاتی مضامین بھی اس
میں شامل نہیں کیے گئے خصوصاً ایسی تنقید پر جو نسائیت کے
حوالے سے مسلسل لکھتی رہی وہ لگ کتابی شکل میں شائع ہوں گے۔(۲۶)

اس کتاب میں فاطمہ حسن نے ان نابغۂ روگار شخصیات کی تعلیمات کو پیش کیا ہے جیسے آزاد کے بارے میں لکھتی ہیں کہ وہ عصری شعور سے بہرہ ور تھے۔ فاطمہ حسن مزید لکھتی ہیں کہ ان کا عہد، وہ عہد ہے جب برصغیر میں سیاسی سماجی تعلیمی اور ادبی تحریکوں کی رہنمائی ایسے صاحب دانش اور اہل قلم کر رہے تھے جو روشن خیال تھے۔ سرسید حالی شبلی آزاد تعلیم اور ادب دونوں میدانوں میں حالات کے تقاضوں کا ادراک رکھتے تھے، اور عملی اور تحریری طور پر بھرپور کردار ادا کر رہے تھے۔ ان کی روشن خیالی برصغیر میں فکری و سماجی انقلاب کی بنیاد بنی حالی اور آزاد نے تاریخ ادب اور شاعری کے ساتھ بچوں کے لیے تدریسی کتابیں تحریر کیں ان دونوں نے لڑکیوں کے لیے بھی تدریسی کتابیں تحریر کیں جو اس وقت ناپید تھیں۔ یہ اس سماج کی ضرورت تھی جو انھوں نے پوری کی۔ اب ہمیں اپنے سماج کی ضرورت کے مطابق چلنا ہو گا۔

ہر عہد کے اپنے مسائل ہوتے ہیں انہیں لکھتے ہوئے اس عہد کے مزاج سے قریب ترین اظہار اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب لکھنے والے کو بدلتے ہوئے وقت کا احساس ہو اور وہ جاری عہد میں ہونے والی تبدیلیاں محسوس کر رہا ہوں انور شعور ایسے ہی شاعر ہیں جنہوں نے اپنی تحریروں میں عصر حاضر کے مسائل کو پیش کیا ہے فاطمہ حسن کو ان مسائل کا ادراک ہے اس لیے موجودہ مسائل اور معاشرے سے ہم آہنگ کر کے وہ انور شعور کی شاعری کا تجزیہ کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ انور شعور صوفی نہیں، شاعر ہیں۔ ایسا شاعر جو اپنی تحریروں میں سماجی مسائل کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ان کے رویے میں تصادم نمایاں ہے۔ وہ تصادم جو ماحول اور ان اقدار سے ہے۔ جو روایت پرست معاشرے نے ان کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے لہجے کی انفرادیت، ان کے ڈکشن کا تنوع اور شاعری میں خالصتاً شہری زندگی کے تضادات اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اپنے عہد کے مسائل سے دوچار ہیں اور نہ صرف دوچار ہیں بلکہ اس کے اظہار کے لیے انھوں نے وہی زبان استعمال کی ہے جو ان مسائل کے لیے موزوں بھی ہے اور مستعمل بھی انور شعور نے جو کچھ لکھا

ہے اپنا لکھا ہے کسی سے کچھ مستعار نہیں لیا۔

فاطمہ حسن چونکہ اپنے عہد کے سماجی مسائل سے آگاہ ہیں اس لیے انھیں معلوم ہے کہ کون کون سے ادیب اور لکھنے والے ایسے ہیں جنھیں اپنے عہد کے مسائل کا ادراک ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں ان ادیبوں کا عصری شعور واضح کیا ہے۔ مثلاً بیدی کے بارے میں لکھتی ہیں کہ بیدی اپنی کہانیوں میں عورت کے ساتھ زیادتی پر نالاں اور گریہ کناں نظر آتے ہیں کہ وہ ساری زندگی بچے پیدا کرنے کی تکلیف اور ان کی پرورش کی مشقت میں مبتلا رہتی ہے۔ اس کے ساتھ سماجی رویے ظالمانہ ہیں، اس کی ضرورتوں اور آرام کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ تاہم وہ عورت کو اس صورت حال سے علیحدہ ایک ایسے مکمل انسانی وجود میں نہیں دیکھتے جہاں وہ بچوں اور گھر کے پردے میں چھپی اس سیاست کو آشکار کریں جو مردوں نے اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے بڑی مہارت سے ایک ایسا نظام وجود میں لانے کے لیے چلی ہے جس میں عورت صرف ایک کم زور مہرہ ہے۔ وہ اقدار و روایات جو مرد نے تشکیل دی ہیں اور جس میں عورت کا باشعور وجود کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کے احساسات و جذبات کا خیال نہیں رکھا جاتا عورت کو محض ایک جانور کی مانند سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً فاطمہ حسن بیدی کی کہانی "آلو" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتی ہیں کہ لکھی سنگھ عورتوں کے بارے میں متعصبانہ رویہ رکھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ بچے تو انگریز عورتوں کو پالنے آتے ہیں، ہندوستانی عورتوں کو ماں بننے کا کوئی حق نہیں۔ فاطمہ حسن کے بقول اس افسانے میں انھوں نے ہندوستانی نظام میں عورت کی تضحیک اور اس کی ابتر حالت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی قلعی کھولی ہے۔

فاطمہ حسن لکھتی ہیں۔

> بیدی نے ان سوشلسٹوں کی بھی پول کھولی ہے جو بھاشن تو بہت جھاڑتے
>
> ہیں مگر بچوں کی ذمہ دار صرف ماں کو سمجھتے ہیں۔(۲۷)

فاطمہ حسن عصر حاضر کے سماجی مسائل کو بیدی کی کہانیوں کے ذریعے واضح کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہمارے سماج میں بیٹے کی پیدائش پر ہر ماں کو فخر ہوتا ہے اور بیدی نے سماجی مسائل کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ بیدی عورت کی عظمت سے آگاہ ہیں۔ وہ عورت کی عظمت اس بات سے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آخر عورت ہی تو مرد کو جنم دیتی ہے۔ تو پھر

عورت کے ساتھ سماجی سطح پر بہتر سلوک ہونا چاہیے۔ فاطمہ حسن بیدی کے اس رویے پر غصے کا اظہار کرتی ہیں کہ گویا بیدی کے نزدیک عورت کی اصل اور واحد قوت لڑکے کو جنم دینا ہے۔ بیدی کے نزدیک بیٹا پیدا کرنے والی ماں کو معاشرے میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جبکہ بیٹیاں پیدا کرنے والی ماں کو حقیر اور منحوس سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ بیدی اس عورت پر رحم کھاتے ہیں۔ بیدی کا عورت کے بارے میں یہ عموی رویہ ہے اور اپنی کہانیوں میں انھوں نے متعدد مقامات پر ہر طبقے کی عورت کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ وہ عورت کو کسی مختلف حیثیت سے نہیں دیکھتے۔(۲۸)

فاطمہ حسن بیدی کے عورت کے بارے میں سماجی خیالات کا اظہار واضح الفاظ میں بیان کرتی ہیں کہ بیدی کے نزدیک عورت سماج میں ہمیشہ مرد کی دست نگر رہے گی۔ بیدی کا یہ یقین ہے جسے وہ حقیقی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ عورت کو جو ایسے حالات میں آجائے جہاں مرد اس کے بچے کی ذمہ داری قبول نہ کر سکے۔ تو بھکارن اور طوائف کے سوا کسی روپ میں نہیں دیکھ سکتے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ دوبارہ کسی ایسے مرد کی بیوی بن جائے جو اس کی اور اس کے بچوں کی ذمہ داری لے لے۔ فاطمہ حسن بیدی کی کہانیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ صدیوں سے ہماری مذہبی اور دیومالائی کتابوں نے عورت کے لیے ایک ہی کردار متعین کیا ہے جس میں وہ مرد سے کم تر ہے۔ کیونکہ وہ جسمانی طور پر کم زور ہے جذباتی طور پر زیادہ حساس ہے اور معاشرتی دباؤ قبول نہیں کر سکتی یہ مفروضہ کہ عورت بزدل ہے ناقص العقل ہے مردانہ سماج کی دین ہے۔ انھوں نے اپنی مرضی، خیالات اور آسانیوں کے مطابق عورت کا ایک وجود فرض کر لیا ہے اور اسی عورت کو زندگی میں بھی اور تحریر میں بھی برت رہے ہیں، مرد انسان ہے، عورت کچھ اور ہے۔ کوئی دیوی، فرشتہ، شیطان، کوئی چیز اس کا فیصلہ اس کے لیے مشکل ہے کیونکہ اس نے تو مکمل انسان کو دیکھا ہی نہیں جو فکر، شعور، ادراک اور احساسات میں اس کا ہم پلہ ہے۔

عورت کو صدیوں سے محکوم رکھا گیا ہے۔ سماجی سطح پر عورت کو بہت مسائل ہیں۔ عورت کو ان رسوم ورواج کے پردے میں عورت کو معاشرتی زندگی سے اس طرح الگ کر دیا گیا کہ مکمل اپنی ذہانت اور توانائی کے ساتھ سامنے ہی نہ آسکے۔ محکوم، بیوی، داشتہ، طوائف، بھکارن یہ وہ کردار ہیں جنھیں افسانہ نگار اپنی اپنی بساط، تخیل یا اساطیر کے حوالوں سے لکھتے رہے ہیں۔

فاطمہ حسن کو سماجی سطح پر یہ ادراک ہے کہ عصر حاضر کا ادیب ان مسائل سے نبر آزما ہے وہ اپنے ملک کے ساتھ ساتھ دیگر اسلامی ممالک کا بھی احساس کرتے ہیں۔ جیسے زہرا نگاہ کے بارے میں لکھتی ہیں کہ بد صورت سچائیاں، خوبصورت نظموں میں لکھنا، اپنے زخم ادھیڑ کر خود دینے کی اذیت سے گزرنے کا عمل ہے۔ زہرا نگاہ عراق ہو یا افغانستان، ہمارا ملک پاکستان ہو یا اس بے اماں دنیا میں اجڑتا ہوا کوئی بھی شہر، وہ اس کا کرب کو محسوس کرتی ہیں پھر منظوم کرتی ہیں۔ یہ نظمیں شہر آشوب نہیں ہیں۔ یہ نظمیں عصری آشوب ہیں۔ زہرا نگاہ کی نظم "ایک منتشر نظم" کا تجزیہ کرتے ہوئے فاطمہ حسن کہتی ہیں کہ اس نظم میں انھوں نے پراگندہ ماضی، حال اور مستقبل کے اندیشے کو اس طرح منظوم کیا ہے کہ اس انتشار کی کیفیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ جس میں ہم جی رہے ہیں۔ حکم رانوں کی سفاکیاں، امیروں کی خود غرضیاں، عوام کی نادانیاں، محکوموں کی بے بسی، حساس شعرا کی کیفیات، بچوں کا مستقبل اور اندیشے، بہت کچھ اس نظم میں منتشر ذہنی کیفیت اور خواب کا سہارا لے کر لکھ دیا گیا ہے۔ اسی طرح زہرا نگاہ کی نظم "فراق" میں غیرت کے نام پر باپ کے ہاتھوں قتل ہونے والی بیٹی پر ہے۔ اس میں درد کی کیفیت اتنی شدید ہے کہ اسے رقت انگیز نوحہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہمارے معاشرتی المیے پر عورت کی بے بسی اور قبیح رسموں کی بربریت ایسے بیان کی ہے کہ سماج کا ہر عنصر واضح کھل کر سامنے آتا ہے۔(۲۹)

شاہدہ حسن عصر حاضر کی مقبول شاعرہ ہیں جن کے بارے میں فاطمہ حسن کہتی ہیں کہ شاہدہ کا شعری لہجہ اپنے عہد کے شعور سے بنا ہے۔ وہ آج کے سماجی، سیاسی، ادبی مسائل، رجحانات اور میلانات کا مکمل ادراک رکھتی ہیں۔ انھیں اپنی ذات پر مکمل اعتماد بھی ہے۔ وہ اعتماد جو اس فرد کو حاصل ہوتا ہے جو معاشرے میں اپنا کردار پوری آگہی کے ساتھ ادا کر رہا ہو۔ یہ مشکل اور تکلیف دہ راستہ ہے مگر تخلیقی سفر کے لیے اسی راستے پر چلنا پڑتا ہے اور قدم جما کر چلنا پڑتا ہے۔ شاہدہ کی تحریروں میں یہ عصری کرب نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ محمد شاہ مری کے عصری خیالات کو بھی واضح کرتی ہیں۔(۳۰)

فاطمہ حسن نے شاہ محمد مری کی کتاب "بلوچ سماج میں عورت کا مقام: ایک مطالعہ" پر تفصیلی بات کی ہے کہ یہ کتاب بلوچ علاقے کی خواتین کی طرز زندگی، ان کے مسائل اور ان پر ہونے والے ظلم و جبر کی تحقیقی دستاویز ہے۔ یہ کتاب عورتوں کی حالت زار بدلنے کی خواہش ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب خواتین کو خود اس بات کا ادراک ہو کہ انھوں

نے اپنی حالت بدلنی ہے اسے بدلنے کے لیے ان میں شعوری تحریک بیدار کرنا ضروری ہے۔ شاہ مری کی یہ خواہش مارکس ازم کا حصہ ہے جس میں جبر کی قوت کے خلاف بغاوت کرنا اور معاشرے کو ہر استحصال سے پاک کرنا، ہر اس فرد اور طبقے کا فرض ہے جو اس سے دوچار ہے۔ چونکہ مصنف کا تعلق خود بلوچستان سے ہے اس لیے وہ اس نظام کی سفاکیوں سے آگاہ ہیں۔ اس لیے وہ اپنی قلم کی نوک سے اس سماج کے بخیے ادھیڑتے ہیں۔ وہ ایسے سماج کو بے نقاب کر رہے ہیں۔ جہاں جہالت نے ایک پورا انسانی گروہ تاریکی میں دھکیل رکھا ہے۔ ایسے سماج پر لکھنا بہت مشکل ہے جو پسماندہ بھی ہو اور جبر میں مبتلا بھی ہو جہاں انسانی مقام کے بارے میں بھی سوچنے کا ماحول نہیں ہے وہاں عورت کے بارے میں لکھنا بہت بڑا کام ہے۔ یہ عصری شعور رکھنے والے ادیب کا ہی دل گردہ ہے کہ وہ ایسے موضوعات پر لکھے۔ (۳۱)

عصر حاضر کا ایک اہم سماجی مسئلہ تعلیم اور بالخصوص مسلمان لڑکیوں کی تعلیم ہے جس کے بارے میں فاطمہ حسن نے کھل کر بات لکھی ہے۔ انھوں نے بلوچستان میں عورت کے مسئلے پر شاہ محمد مری کے خیالات سے مکمل اتفاق کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ نصاب اور تعلیم کے باب میں انھوں نے جو مشورہ دیا ہے وہ پورے ملک کی لڑکیوں کی تربیت کے لیے اہم ہے۔ تعلیم کا پورا باب ہمارے ملک کے مقتدر حلقے کو فکر کی دعوت دیتا ہے تعلیم ہی خواتین کے مسائل کا واحد حل ہے کیونکہ جب تک ان میں وہ شعور پیدا نہ ہو جو علم عطا کرتا ہے ان کے لیے سماج میں کوئی حیثیت حاصل کرنا ممکن نہیں۔ کاغذ پر لکھے ہوئے حقوق ان کے لیے بے معنی ہیں جن کا انھیں علم ہی نہیں۔ یہ حقوق تو ان کے شعور کے ذہن میں نقش ہونے چاہیے تاکہ وہ جہاں عورت کی حق تلفی دیکھیں اس پر احتجاج کریں۔ رویے صرف قانون سے نہیں بدلے جاسکتے۔ اس کے لیے پورے ماحول، سماج اور افراد کو تبدیلی کے لیے باقاعدہ تیار کرنا پڑتا ہے۔

اسی طرح فاطمہ حسن فرحت پروین کا عصری شعور واضح کرتی ہیں کہ فرحت پروین نے اپنی کہانیوں کے تانے بانے زندگی کی سفاک حقیقتوں سے بنے ہیں۔ ان کے زیادہ تر کردار حالات کی سنگینی اور سماجی ناانصافی کا شکار ہیں۔ فرحت پروین نے اس بے رحم معاشرے میں پیش آنے والے معاشی و سماجی جبر بہت شدت سے محسوس کیا ہے اور معاشرتی ناہمواریاں معاشرتی نظام سے مربوط دیکھی ہیں۔ ان کا حساس مشاہدہ ان ناانصافیوں پر انھیں اس قدر مضطرب رکھتا ہے کہ وہ تلخیوں کو بساط بھر کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے خود بھی ایک ایسا کردار بن جاتی ہیں۔ جس کے گرد

روایات ہیں۔ ان کے کردار ان روایات کو توڑتے نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ کردار ہمارے عہد کی سچائیوں کو بیان کرتے ہیں ایسے ہی سچے کردار ہم عصروں کو قریب لاتے ہیں۔(۳۲)

اسی طرح فاطمہ حسن فہمیدہ ریاض کے بارے میں لکھتی ہیں کہ انھیں اپنے عصر میں اس بات کا ادراک تھا کہ عورت کی سماجی حیثیت کم تر ہے انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے صنف کے مسائل ہی کو نہیں، بلکہ پورے معاشرے کو لکھا ہے۔ وہ دکھ جو سماج نے دیے وہ استحصال جو زور آوروں نے کیا۔ ان کی شاعری کے موضوعات بنے اور بڑی خوبصورتی سے بنے۔ فیض احمد فیض کے بارے میں فاطمہ حسن کہتی ہیں کہ فیض ایسا دانش ور ہے جو اپنے عہد سے آگے دیکھتا ہے جس کا حساس وجود اپنے عہد سے غیر مطمئن ہوتا ہے۔ وہ تبدیلی چاہتا ہے اور اپنا عہد ایک اچھے مستقبل کی راہ پر لگانے میں حصہ دار بنتا ہے۔ اس کی فکر جب اظہار پاتی ہے تو وہ رجعت پسندوں کے لیے خطرہ بن جاتا ہے اس کے خلاف سازشیں ہوتی ہیں اور عام پس ماندہ ذہن رجعت پسندوں کے ہم نوا بن جاتے ہیں۔(۳۳)
فاطمہ حسن کی تحریروں میں عورت کو مرکزیت حاصل ہے۔ ان کی تحریروں میں عورت کا مقام واضح ہے کسی بھی تخلیق کار کے لیے یہ آسان ہدف نہیں کہ وہ عورت کے مسائل کو بہ بانگ دہل بیان کر سکے اور عورت کے لیے تو یہ اور بھی مشکل ہے کہ وہ اپنی کہانیوں میں جیتی جاگتی عورت کو پیش کر دے۔ فاطمہ حسن کا کمال یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں عورت سانس لیتی محسوس ہوتی ہے انھوں نے خواتین کے بہت سے سماجی مسائل کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں بطور خاص زاہدہ خاتون شیر انیہ کو موضوع بنایا۔ فاطمہ حسن نے زاہدہ خاتون کی زندگی کے ہر گوشے تک ممکنہ رسائی کی۔ زاہدہ خاتون کی شاعری میں موضوعات کا تنوع ہے ان کے ہاں عصری شعور و مسائل سے ہم آہنگی اور نسائی شعور کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ یہ وہ پہلی خاتون شاعرہ ہیں جو اپنی منفرد طرز کلام کی وجہ سے انفرادیت کی حامل ہیں۔ جنھیں نہ تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی عام الفاظ میں ان کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ زاہدہ خاتون کو کم عمری میں ہی برصغیر کے سیاسی و سماجی مسائل کا ادراک کرنے لگی تھیں۔ ان کو حصول علم کی تو اجازت ملی مگر اظہار کی اجازت میسر نہیں تھی جو ان جیسی علمی و ادبی فرد کو ملنی چاہیے تھی۔ جس کی وجہ سے انھوں نے ہمیشہ اپنی شناخت پوشیدہ رکھی۔(۳۴)

خاموشی کی آواز میں شامل فاطمہ حسن کا اپنا مضمون "نسائی ادب اور تنقید" نسائی تنقید کی متنوع جہات کو واضح کرتا ہے۔ وہ نسائی تنقید کے متعلق اپنے نظریات میں لکھتی ہیں کہ نسائی ادب کا مطالعہ دراصل نسائی احساسات و شعور کا مطالعہ ہے۔ وہ احساسات و شعور جو بحیثیت فرد ایک خاتون لکھنے والی کو مرد لکھنے والے سے جدا کرتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تاریخی، سماجی، اور نفسیاتی عوامل تحریر و تخلیق پر اثر انداز نہ ہو رہے ہوں۔ ہر تخلیق کا تجزیہ ان ہی اثرات کا تجزیہ ہوتا ہے۔ چناں چہ کسی بھی خطے اور عہد کا ادب اس عہد کے معاشرتی رجحانات اور اقدار کا ایسا باطنی رخ بھی پیش کرتا ہے جو تاریخ یا وقائع نگار کی تحریر میں موجود نہیں ہوتا۔ یہی رخ ادب کو ممتاز و ارفع کرنے کی ایک وجہ ہے دوسری وجوہات میں جمالیات سرفہرست ہے اس بات کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو خواتین سماجی اقدار سے جو وابستگی رکھتی ہیں وہ مردانہ وابستگی سے مختلف ہے۔ خواتین کا جمالیاتی ذوق بھی دوسرے مردوں سے مختلف ہے۔ جب ان کی تحریر میں اس کا اظہار ہوتا ہے تو کیا قاری اس ادراک کے بغیر اس کی تفہیم کر سکتا ہے کہ یہ تجربہ یا مشاہدہ یا احساس اس کی ذات سے مختلف ہو سکتا ہے۔ (۳۵)

فاطمہ حسن نے اپنی کتاب فیمنزم اور ہم میں گزشتہ صدی سے عہد حاضر تک اردو ادب میں نسائی شعور کے متعلق مضامین تحریر کیے ہیں جس میں انھوں نے خواتین کی تخلیقی صلاحیتوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس صدی میں خواتین نے جو ادب تخلیق کیا اور اس کا اردو ادب پر جو اثر پڑا اس کو فاطمہ حسن نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ برصغیر کے سماجی نظام میں یہ گنجائش کم تھی کہ خواتین تخلیقی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کر سکیں لیکن ان واقعات کے باعث بھی خواتین نے محنت کے ساتھ جو ادب تخلیق کیا اسے نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ فاطمہ حسن نے نسائیت کے حوالے سے اردو ادب کو فروغ دینے اور روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ (۳۶)

فاطمہ حسن نے اپنے عہد کے ان مسائل کا مکمل احاطہ کیا ہے جن سے عصر حاضر میں پاکستانی معاشرہ دوچار ہے۔ انھوں نے عورت اور اس کے متعلقات، سماج اور اس میں موجود منتشر خیالی اور عصر حاضر میں ہر اس ذرائع تک رسائی حاصل کی جس کے ذریعے وہ اس عہد کے مسائل کو پیش کر سکیں ان کی تحریروں میں موجودہ سماج کی عمدہ عکاسی ملتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نجیبہ عارف، رفتہ و آیندہ، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء، ص ۲۶۲۔

۲۔ فاطمہ حسن، کہانیاں گم ہو جاتی ہیں، کراچی: شہرزاد پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۲۴۔

۳۔ ایضاً، ص ۴۱۔

۴۔ ایضاً، ص ۷۸۔

۵۔ ایضاً، ص ۱۴۷۔

۶۔ ایضاً، ص ۱۲۸۔

۷۔ ایضاً، ص ۹۵۔

۸۔ ایضاً، ص ۹۸۔

۹۔ فاطمہ حسن، میلے میں گم، مشمولہ ماہنامہ قومی زبان دسمبر ۲۰۱۴، ص ۷۵۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۷۵۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۷۶۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۷۷۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۷۸۔

۱۴۔ فاطمہ حسن، آدھا گاؤں میں محرم، مشمولہ جواہر، شمارہ ۵، کراچی: رضویہ سوسائٹی، ۲۰۰۸ء، ص ۵۷۔

۱۵۔ ایضاً۔

۱۶۔ فاطمہ حسن، نہ سمجھو گے تو۔۔۔۔۔، مشمولہ ماہنامہ قومی زبان، نومبر ۲۰۱۷، ص ۳۔

۱۷۔ فاطمہ حسن، اداریہ، ایضاً، دسمبر ۲۱۰۹ ص ۴۔

۱۸۔ ایضاً، جون۲۰۱۹ء، ص۵۔

۱۹۔ ایضاً، ص۴۔

۲۰۔ ایضاً، جنوری۲۰۱۹ء، ص۴۔

۲۱۔ ایضاً، اکتوبر۲۰۱۵ء، ص۴۔

۲۲۔ ایضاً، ستمبر۲۰۱۹ء، ص۵۔

۲۳۔ ایضاً، جولائی۲۰۱۷ء، ص۵۔

۲۴۔ ایضاً، فروری۲۰۱۹ء، ص۴۔

۲۵۔ ایضاً، مارچ۲۰۱۸ء، ص۴۔

۲۶۔ فاطمہ حسن، کتاب دوستاں، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص۸۔

۲۷۔ ایضاً، ص۳۲۔

۲۸۔ ایضاً، ص۳۳۔

۲۹۔ ایضاً، ص۸۲۔

۳۰۔ ایضاً، ص۸۸۔

۳۱۔ ایضاً، ص۹۴۔

۳۲۔ ایضاً، ص۱۲۴۔

۳۳۔ ایضاً، ص۱۳۸۔

۳۴۔ فاطمہ حسن، زاہدہ خاتون شروانیہ (ز خ ش)، کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۱۴ء، ص۱۱۵۔

۳۵۔ فاطمہ حسن، خاموشی کی آواز، کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۱۸ء، ص۴۳۔

۳۶۔ فاطمہ حسن، فیمنزم اور ہم، کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۱۵ء، ص۷۔

باب سوم

فاطمہ حسن کی تحریروں میں خواتین (بطور صنف اور انفرادی فرد) کے کردار کی پیش کش

باب سوم

فاطمہ حسن کی تحریروں میں خواتین (بطور صنف اور انفرادی فرد) کے کردار کی پیش کش

کائنات کے بننے کے ساتھ ہی عورت کی اہمیت مسلم ہو گئی کہ اس کے بغیر نہ کائنات مکمل تھی نہ مرد مکمل تھا اس لیے عورت کی اہمیت مانی ہوئی ہے۔ اس دنیا کا کوئی بھی پہلو عورت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا عورت نے زندگی کے ہر میدان میں اپنے وجود کو تسلیم کروایا ہے وہ ایک طرف تو اپنی بدنی جمالیات سے مرد کی تسکین کرتی ہے تو دوسری طرف محبت و انسانیت اور ماما تا سے لبریز دل سے افراد خاندان اور اور معاشرے کو محبت سے تشکیل دیتی ہے۔ لیکن مرد کے بنائے ہوئے معاشرتی رسم ورواج نے آج تک عورت کی ذہنی صلاحیت کو تسلیم کرنے میں پس و پیش سے کام لیا ہے دنیا کے ہر اعلیٰ پائے کے ادب کا موضوع عورت ہی رہی ہے۔ فاطمہ حسن کی تحریروں میں عورت کو ایک الگ تشخص سے پیش کیا گیا ہے۔ عورت کی دنیا مرد سے الگ ہوتی ہے اس کے جذبات واحساسات، اس کی سوچ اور اس کی ترجیحات عورت سے متعلق معاملات کو پیش کرتی ہیں۔ ان کی تحریروں کے دو رخ ہیں ایک میں اجتماعی شعور واضح ہوتا ہے جبکہ دوسرا رخ عورت کے وجودی تشخص سے متعلق ہے۔ ان کی تحریریں عورتوں کی بیداری میں معاون ہیں۔

فاطمہ حسن کی تحریروں میں عورت کو مرکزیت حاصل ہے۔ ان کی تحریروں میں عورت کا مقام واضح ہے کسی بھی تخلیق کار کے لیے یہ آسان ہدف نہیں کہ وہ عورت کے مسائل کو بہ بانگ دہل بیان کر سکے اور عورت کے لیے تو یہ اور بھی مشکل ہے کہ وہ اپنی کہانیوں میں جیتی جاگتی عورت کو پیش کر دے۔ فاطمہ حسن کا کمال یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں عورت سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ فاطمہ حسن کا افسانوی مجموعہ کہانیاں گم ہو جاتی ہیں تمام کا تمام عورت کے سماجی مسائل کا پس منظر واضح کرتا ہے۔ اس مجموعے کی پہلی اشاعت ۲۰۰۰ء میں ہوئی اس وقت سے اب تک ان کہانیوں کئی مرتبہ شائع کیا جا چکا ہے۔ اس مجموعے میں ان کی کل ۲۴ کہانیاں شامل ہیں اور ایک

کہانی کا ترجمہ "رضائیوں والا گھر" کے عنوان سے شامل ہے۔اس مجموعے کی دیگر کہانیوں کے عنوان بھی عورت اور اس کی نفسیات کو ظاہر کرتے ہیں مثلاً

۱۔بلیک آرٹ ۲۔پری میچور برتھ ۳۔عام سی لڑکی ۴۔چھوٹے بڑے لوگ ۵۔چھتیس نمبر ۶۔وقت اور فاصلہ

۷۔چوتھے کونے کا آسیب ۸۔سفر میں ۹۔جھوٹے پھل ۱۰۔بدلتی ہوئی جون ۱۱۔تلاش ۱۲۔زمین کی حکایت

۱۳۔کہانی ایک شہزادی کی ۱۴۔وہ بچہ ۱۵۔ٹھہری ہوئی یاد ۱۶۔وہ مجھے دیکھ رہی تھی ۱۷۔بے چاری

۱۸۔حصار ۱۹۔وزیر مر گیا۔وزیر زندہ ہے۔ ۲۰۔خریدار ۲۱۔تم کو رقم کریں گے ۲۲۔کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا؟

۲۳۔مہلت کا وقفہ ۲۴۔بیگم اعجاز

اس مجموعے میں شامل یہ تمام افسانے عورت کے رویوں اور مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں ان کی کہانیوں میں سادگی، سلاست اور روانی موجود ہے۔فاطمہ حسن اپنی کہانیوں میں ہمارے اطراف کے کرداروں کو جوڑ کر کہانی بناتی ہیں۔ ان کی کہانیاں عورت کی انفرادی حیثیت پر مبنی اور غیر ثانوی حیثیت کا جرات مندانہ اظہار ہے۔ان کہانیوں میں پدر سری معاشرے کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔پاکستانی سماج میں عورت سے روا رکھے جانے والے رویے ان کہانیوں میں نظر آتے ہیں جن میں عورت کی شناخت ثانوی چیز کی بن کر رہ جاتی ہے۔

فاطمہ حسن کے افسانوں میں عورت حبس و گھٹن سے الگ زندگی گزارتی نظر آتی ہے۔ان کے ہاں عورت انفرادی فردکی حیثیت سے نظر آتی ہے۔ان کی زندگی کے مثبت پہلو ان کے افسانوں میں پیش کیے گئے ہیں ان کی افسانوی عورتیں کھل کر بات کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں مثلاً

پری میچور برتھ ان کا ایسا افسانہ ہے جس میں عورت بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہے۔اس کہانی کا مرکزی کردار ایک لڑکی ہے جو بہت شوخ و چنچل ہے اس لڑکی کو پامسٹری سے بھی شغف ہے۔انتہائی خوبصورت حسین و جمیل یہ لڑکی اپنے حسن پر نازاں بھی ہے۔کہانی ایلیٹ کلاس کی خواتین کی نمائندہ ہے۔کہانی کا منظر اور بیانیہ ایک گھر

تک محدود ہے اور اس میں خود کلامی اور بیانیہ تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ کہانی میں دور حاضر کے ایک بڑے مسئلے پری میچیور برتھ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جس کے لیے اردو اصطلاح ستوانسی استعمال کی گئی ہے۔ عام طور پر نارمل بچہ نو ماہ میں پیدا ہوتا ہے۔ مگر جب کوئی نارمل بچہ سات ماہ میں پیدا ہو جائے تو اس کا مطلب ماں کے ناجائز تعلقات ہیں جن کا تذکرہ افسانے میں پری میچیور برتھ کے ذریعے کیا گیا ہے۔ وہ کہتی ہے۔

میں نے انھیں بتادیا کہ میں کل میرج کے لیے جارہی ہوں۔

"کیوں"؟ ان کا چہرہ اتنا ہی سپید تھا جتنا پہلے۔

"اس لیے کہ میں کوئی ستوانسا بچہ نہیں پیدا کر سکتی۔" (۱)

ان کی خواتین جرات مند ہیں جو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کالوہا منوانے کی ہمت رکھتی ہیں۔ یہ خواتین معاشرے میں نہ صرف اپنی شناخت تسلیم کراتی ہیں بلکہ اپنے بنیادی حقوق اور معاشرے میں انسانی حقوق کے لیے بھی عملی جدوجہد کا آغاز کرتی نظر آتی ہیں۔ حقوق نسواں کے ساتھ ساتھ سماج و معاشرے پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ ان کی کہانیوں میں نسوانیت پسندی کا گہرا تاثر ملتا ہے۔

"مرد بہت ڈھیٹ ہوتے ہیں اگر اسے میری کمزوری کا پتا چل گیا تو اس کے ہاتھ

میرے ہاتھوں سے بڑھ کر جانے کہاں پہنچ جائیں گے۔" (۲)

فاطمہ حسن نے اپنے افسانوں میں عورت کے لیے کھل کر لکھا ہے انھوں نے اپنی تحریروں میں ہر اس مسئلے کو جگہ دی ہے جو معاشرے پر اور خاص طور پر خواتین پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ ان کے یہاں حقوق نسواں کے حوالے سے بچیوں کی تعلیم، لڑکے اور لڑکی میں صنفی امتیاز، ونی، قرآن سے شادی اور کاروکاری جیسی سفاکانہ رسم کے حوالے سے مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کا افسانہ "وہ مجھے دیکھ رہی تھی" ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس میں سماجی سطح پر عورت کا استحصال دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ہمارے ہاں عورت کو صرف ایک ہتھیار، آلے یا ٹول کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ عورت خاندانی لحاظ سے اپنی تمام عمر شوہر اور بچوں کے لیے صرف کرتی ہے۔ مگر اس کے باوجود اسے کسی قسم کی خود مختاری حاصل نہیں ہوتی ہے کہ وہ خود سے کچھ کر سکے۔ اس افسانے میں ایک باشعور پڑھی لکھی نوکری کرنے والی عورت کی کہانی پیش کی گئی ہے جو نوکری کرتی اور خوش باش اپنی زندگی بسر کرتی ہے۔ معاشرہ اس کی خود

مختاری کو کچھ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ جب اس عورت کا انتقال ہو جاتا ہے تو وہ کفن دفن کا انتظام اپنے پیسوں سے کرنے کی وصیت کرتی ہے اس کے جنازے پر موجود اس کی سہیلی اس کے اس فیصلے پر حیران کھڑی اس کی لاش کو غور سے دیکھ رہی ہے اور خود اس سے مخاطب ہو کر پوچھ رہی ہے۔ کہ تم نے یہ وصیت کیوں کی؟ اسی دوران جنازے میں موجود کچھ عمر رسیدہ خواتین کی سوچ سامنے آتی ہے یہ خواتین پڑھی لکھی باشعور خواتین کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی ہیں۔ اس لیے ان کے کہے گئے جملے ان کی ذہنیت کے عکاس ہیں۔

بڑھی بوڑھیوں کے لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ ارے یہ نوکری
کرنے والی عورتیں خود مختار ہوتی ہیں۔ یہی اس کی مرضی ہوگی سو کرلی۔ (۳)

نوکری پیشہ عورتوں کے متعلق ایسے تصورات ہمارے معاشرے کا عام حصہ ہیں۔ ایسی خواتین کو عمومی طور پر خود مختار و آزاد سمجھا جاتا ہے کہ خود کمارہی ہیں ایسی عورتوں کو کون قابو کر سکتا ہے۔ ایسی عورتوں کے متعلق یہی گمان کیا جاتا ہے کہ اپنی زندگی میں وہ سب کچھ اپنی مرضی سے کرتی ہوں گی۔ حالانکہ حقیقت میں وہ اپنے گھر والوں اور خاص طور پر شوہر کی مرضی سے کام کر رہی ہوتی ہیں۔ یہ افسانہ ظاہر کرتا ہے کہ عورت اپنی سانس لینے تک تو خود کو محسوس کروانے سے قاصر رہتی ہے مگر مرتے وقت جو وصیت کرتی ہے یہ وصیت اس کے حق میں باتیں بنانے کا سبب بنتی ہے ۔ افسانے کا مرکزی کردار ہمیشہ یہی سوچتی رہتی ہے کہ کیا کبھی میرے ہونے کو محسوس کیا گیا؟ اس اذیت سے کون وا قف ہو سکتا ہے جس اذیت سے یہ پڑھی لکھی باشعور عورت گزرتی ہے۔ یہ کہانی معاشرے میں عورت کے متعین کردار اور اس کے فرائض پر ایک سوالیہ نشان بھی ہے کہ کس طرح عورت اپنی کمائی کے باوجود معاشرے میں ایک فرد محض بن کر رہ جاتی ہے اور اس کی شناخت معاشرے کے عمومی رویوں تلے دب کر ختم ہو جاتی ہے اور وہ انفرادی شناخت کھو دیتی ہے۔ اسی طرح کا ایک کردار "بیگم اعجاز" افسانے میں بیگم اعجاز کا ہے۔ ہمارا معاشرتی سطح کا ایک المیہ کام کرنے والی عورت کا ہے جو باہر نوکری کر کے آتی ہے تو گھریلو محاذ پر اس کے لیے کئی طرح کے چیلنجز تیار کھڑے ہوتے ہیں مثلاً

میری کوشش ہوتی ہے کہ تمام میٹنگز دفتر میں ہوں اور میں انھیں نمٹا کر
جلد گھر بھاگوں جہاں دس کام میرے منتظر ہوتے۔ (۴)

جب ایک خاتون بیوہ ہو جاتی ہے تو اس کی زندگی کا پہیہ رک نہیں جاتا۔ عورت کی وجودی شناخت مرد سے نہیں ہوتی، عورت کا وجود اس کا تصور اس کا اپنا ہے اور یہ بات ہمارے سماج میں لوگوں میں سمجھ نہیں آتی اگر عورتیں باشعور ہوں گی تو عورتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کریں گی اور انھیں وہ حقوق ملیں گے جو ان کا حق ہے۔ اپنی سوچ کا گلا گھونٹ کر معاشرے کے لگے بندھے اصولوں کی پرورش کرنے والی، اپنی خواہشات کو بھول کر رشتوں کی ترجیحات میں درجہ بندی کرنا اور اپنا آپ گنوا دینا، اپنی عمر کی پونجی دوسروں کی ضروریات پر خرچ کرنے والی اور اپنی ذات کو مٹا کر دوسروں کو پہچان دینے والی عورت کو فاطمہ حسن اپنا موضوع بناتی ہیں۔ مثلاً وہ اپنی کہانی چھتیس نمبر میں لکھتی ہیں۔

خود پسندی تو کیا کبھی کبھی مجھے لڑکی ہونے کا احساس بھی برا لگتا ہے۔

کاش میں لڑکا ہوتی، آزادی سے گھومتی پھرتی، دوستوں کے گلے

میں بانہیں ڈال کر بات کرتی اور ہاتھ پر ہاتھ مار کر زور سے ہنستی۔(۵)

پاکستان کی عام عورتیں جن مسائل کا شکار ہیں ان میں اہم مسائل روزگار کے مواقع نہ ہونا یا ان میں رکاوٹ، کم تنخواہ، بلا معاوضہ کام، جنسی یا نفسیاتی طور پر ہراسانی، امتیازی قوانین، سیاست میں شمولیت میں رکاوٹیں، معاشرتی تعصب و گھٹن، تشدد، رسم و رواج کی غیر ضروری خرافات، عزت کے نام پر قتل، زنا بالجبر گروہی ریپ، اغوا، گھر اور گھر سے باہر عدم تحفظ، تعلیم کے حصول میں رکاوٹیں، خواتین کے لیے غیر مناسب تعلیمی ماحول، آزادانہ نقل و حرکت میں رکاوٹ، جبری محنت، زبردستی کی شادی، غیر معیاری رہائش، نامناسب خوراک اور بالخصوص دودھ پلانے والی ماں کی خوارک کا مناسب نہ ہونا، پروفیشن کو چننے میں پابندیاں، انصاف تک رسائی میں رکاوٹ اور کھیلوں میں شمولیت میں رکاوٹ جیسے مسائل قابل ذکر ہیں۔ ان تمام مسائل کو فاطمہ حسن اپنی تحریروں میں موضوع بناتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں۔

اب وقت آگیا ہے کہ یہ فکر واضح نقش کی صورت میں ابھر کے سامنے آئے

بنے بنائے مفروضوں کے غبار سے نکل کر عورت اپنی شناخت کے ساتھ اسی

صورت میں ادب کی تاریخ میں داخل ہو سکتی ہے جب وہ خود اپنے ہونے کی

پوری گواہی بن جائے۔(۶)

موجودہ عورت کے بہت سارے بڑے بڑے مسائل ہیں، عورت کو جائداد میں سے حصہ نہ دینا، تعلیم کے مواقع فراہم نہ کرنایابہت کم مواقع دینا، جہیز کے نام پر لوٹ مار کرنا، عورت کو جہیز نہ لانے کی صورت میں زندہ جلا دینا، طلاق کے بعد دوسرے نکاح سے عورت کو ہراساں کرنا۔ آج بھی عورت کے بڑے مسائل میں شمار ہوتا ہے فاطمہ حسن کی تحریروں میں عورت کی اس کش مکش کا تذکرہ ملتا ہے۔

قبائلی علاقہ جات میں عورت آج بھی مظلومیت کا استعارہ ہے، عورت کی قرآن پاک سے شادی، عورت کو ونی کر دینا، اوائل عمر میں شادی، گھریلو تشدد، تیزاب گردی،، عورت کی عزت کی تحفیظ، یہ سب موجودہ عورت کے مسائل ہیں، جن علاقوں میں شرح ناخواندگی زیادہ ہے وہاں پر عورت کے بے شمار مسائل ہیں اُن علاقوں میں عورت کی صحت کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ زچگی کے حوالے سے بے شمار مسائل ہیں وہاں پر عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا ہے اور بعض اوقات تو انسان بھی نہیں سمجھا جاتا۔

عورت اپنے تشخص، سوچ، فکر اور تخیلات کے لحاظ سے ویسی ہی انسان ہے جیسا کہ مرد۔ عورت صلاحیتوں کے لحاظ سے اور انھیں بہترین طریقے سے بروئے کار لانے میں بھی کسی طور مرد سے کم نہیں۔ اس میں خود اعتمادی، تجزیاتی حس، پرکھ، چیلنج کا مقابلہ کرنے کی سکت، حل نکالنے کی قابلیت اور قوت فیصلہ بھی بھرپور طریقے سے موجود ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے بھی عورت اور مرد میں کوئی بنیادی تفریق نہیں، دونوں وجودی لحاظ سے اپنی منفرد صلاحیتوں کے مالک ہیں اگر کہیں اس تناظر میں عورت کچھ پہلوؤں سے کمزور نظر آتی ہے تو اس کی وجہ اس کی ساخت یا جنس نہیں بلکہ وہ معاشرتی سوچ اور رویے ہیں جو اسے کمزور کرتے ہیں۔ وہ اگر جسمانی قوت کے لحاظ سے نسبتاً کم ہے تو اس سے یہ مطلب اخذ کرلینا کہ وہ ہر لحاظ سے کمزور یا کمتر ہے، نری سطح بینی اور کج فہمی ہے۔ یہ خود ساختہ سوچ ایک طرف عورت کی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال نہ ہونے کا سبب ہے تو یہی اسے کمزور اور ناتواں بنانے کی وجہ بھی ہے۔

فاطمہ حسن نے اپنی کتاب خاموشی کی آواز عورت کے حق میں متعین رویوں کے لیے مرتب کی ہے۔ وہ تانیثی رویوں کو سامنے لانا چاہتی ہیں۔ اس کتاب میں دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ آٹھ مضامین پر مشتمل ہے جبکہ دوسرا حصہ نو مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں دو مضمون فاطمہ حسن کے ہیں جب کہ باقی مضامین مرتب کردہ ہیں۔ فاطمہ حسن کی مرتب کردہ یہ کتاب ان کے جن مضامین کا احاطہ کرتی ہے وہ مضامین اگرچہ ان کے اپنے نہیں مگر نسائی ادب

اور عورت کے شعور کو متعین کرنے میں ان مضامین کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ ان مضامین کی قرات یہ بتاتی ہے کہ فاطمہ حسن نے صرف ان مضامین ہی کو کیوں اپنی کتاب کے لیے منتخب کیا اس لیے کہ یہ مضامین دراصل نسائی تنقید کے نمائندہ کہے جاسکتے ہیں ذیل میں ان مضامین کی تفصیل ہے۔

عقیلہ اسماعیل کا مضمون "عورت کی زبان بندی" میں عورت کے سماجی کردار اور اس کی انفرادی شناخت کا بیان ہے۔ عورت کے بارے میں یہی تصور ہے کہ وہ گپ باز، باتونی ہستی ہے، اس لیے اس جبر کی جانب کسی کی توجہ ہی نہیں جاتی کہ ادب کی دنیا میں اگر کوئی عورت پہلے سے مقرر کیے ہوئے دائرے سے ذرا سا بھی قدم باہر نکالنا چاہے تو اس کی زبان بندی کر دی جاتی ہے اسے تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ایسے متعدد موضوعات ہیں جن پر اچھی عورت کو لکھنے کی اجازت نہیں۔ اس لیے خواتین ایسے متعدد موضوعات ہیں جن پر خواتین قلم نہیں اٹھا سکتی ہیں اور جو ان کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ عورتوں کی آواز اور زبان تک، ایک طرح محصور کر دیے گئے ہیں کیونکہ عورت مردوں کی اور اس پورے معاشرے کی غیرت سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے وہ کیا لکھے اور کیسے لکھے اس پر کڑی نگاہ رکھنا ضروری ہے۔ ناشرین اور ادبی پارکھ چونکہ زیادہ تر مرد ہیں اس لیے وہ نہایت آسانی سے کسی ادیبہ یا شاعرہ کی تخلیقی صلاحیت کو کچل کر رکھ دیتے ہیں۔ پورا مضمون عورتوں کی صلاحیتوں پر پابندیوں سے بحث کرتا ہے۔ (۷)

شاہدہ حسن کا مضمون "نسائی شعور زندگی" عورت کے نسائی اظہار سے متعلق ہے۔ نسائی شعور پر مبنی افکار و خیالات اور ان کے مطالعے کو آج دنیا بھر میں بے حد مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ اب عورت کا نسائی شعور بہت پختہ ہو چکا ہے۔ عورتوں نے اپنے بارے میں ہمیشہ مرد کی گواہی چاہی ہے لیکن اب انھیں چاہیے کہ وہ خود بولیں اور اپنی گواہی دیں۔ نسائی شعور کی اہمیت اس لیے بھی مسلم ہے کہ شعور و آگہی کے بغیر جو کچھ بھی لکھا جائے اس کا اپنے عہد، اپنے سماج اور اپنے زمانے کی فکر سے کوئی تعلق نہیں بن پاتا۔ اس اعتبار سے نسائی شعور کا ارتقا جاننا ضروری ہے۔ (۸)

کشور ناہید کا مضمون "ادب اور نسائیت" عورت کے کردار کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ ادب میں عورت کی پیش کش کیسے کی جاتی ہے یہ مضمون اس پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ عورت کی خاموشی، ظلم سہنا، صبر کرنا مشرقیت ہے

جب کہ احتجاج کرنا، بغاوت کرنا، اعتراض کرنا مغربیت ہے اسی کرداری تجزیے کو اساس بنا کر یہاں کی عورت کو پر کھا جاتا ہے یہ اساس آج بھی موجود ہے جس پر یہ مضمون تحریر کیا گیا ہے۔(۹)

مشہور افسانہ نگار خالدہ حسین کا مضمون "بے سر کی عورت "خواتین کے استحصال کی مختلف صورتوں کو نمایاں کرتا ہے۔ اس وقت کی ہم عصر ادیب خواتین عورت کے نئے تصور کو سامنے لا رہی ہیں، وہ عورت کو ایک انسان، معاشرے کا باخبر فرد جانتے ہوئے اس کے تشخص اور اس کی نفسی انفرادیت پر ایمان رکھتی ہیں۔ اسے زندگی کے دھارے میں شامل دیکھتی ہیں۔ آج کی عورت کے اپنے مسائل ہیں اس کی اپنی روحانی تنہائیاں اور جذبات کی شکست و ریخت بھی ہے اس کے دامن میں ہتک اور منافقت اور ملامت کے تجربات بھی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ عورت صرف عورت کے بارے میں ہی لکھے وہ مردوں کے بارے میں، سب لوگوں کے ملکوں اور تہذیبوں اور انسان کے ہاتھوں آنے والی تباہیوں، غرض ہر تجربے کے بارے میں لکھتی ہے کیونکہ وہ ایک وسیع دنیا میں سانس لے رہی ہے اور احترام آدمیت کی قائل ہے اور اس کو مروج رکھنا چاہتی ہے۔(۱۰)

فہمیدہ ریاض کا مضمون "دفتر امکاں" کے نام سے خاموشی کی آواز میں شائع ہوا اس مضمون میں انھوں نے اپنی کتاب بدن دریدہ پر اعتراضات اٹھانے والوں کو جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ کہ اس مجموعے کی بعض نظموں میں عورت کی سیکشوالٹی کا اظہار ملتا ہے۔ تو اسے مبتذل، بے شرمانہ وغیرہ سمجھنے کے بجائے اس ادراک سے پڑھنا چاہیے۔(جو مرد شعرا کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے از خود آپ کو حاصل ہو جاتا ہے) کہ اس کا تعلق محض ایک جسمانی عمل سے نہیں ہوتا بلکہ فرد کی ذات کے اثبات سے بھی ہوتا ہے۔ عام مردوں میں اس کو باعث افتخار اسی لیے سمجھا جاتا ہے کہ وہ غیر شعوری طور پر محسوس کرتے ہیں کہ یہ نسل بڑھانے کی حیوانی جبلت سے بڑھ کر ایک ایسی پراسرار قوت ہے جس کی جڑیں کائنات یا معاشرے میں ان کے فعال کردار ادا کرنے کی صلاحیت میں ہیں اسی طرح عورت کے لیے بھی اپنی سیکشوالٹی کا اظہار اپنے آزاد و باوقار فعال وجود کا اثبات ہے۔

فہمیدہ ریاض بدن دریدہ کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

> بدن دریدہ کی نظموں میں نسوانی جسم کے اعضا کا نام اس لیے آیا
>
> ہے کیوں کہ یہ "چیزیں" نہیں، عورت کے وجود کا حصہ ہیں۔ علامتیں

استعمال نہیں کی گئی ہیں کیونکہ ان نظموں میں یہ اعضا بذات خود ایک
جذبے، ایک انکار کی علامت بن جاتے ہیں ان میں لفظ "پستان" صرف
عورت کی چھاتی نہ ہو کر ایک شدید غصے کا استعارہ ہے۔(۱۱)

تنویر انجم کا مضمون "نسائی تحریک کا ارتقا" پورے نسائی ادوار کا احاطہ کرتا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے بتایا ہے کہ مغرب میں تحریک آزادئ نسواں میں اٹھارویں صدی کے آخر میں کچھ زور پیدا ہوا۔ اسی زمانے میں ہندوستان میں بھی عورتوں کے لیے اصلاحی تحریک کا آغاز ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی نسائی تحریک اور ہندوستان کی نسائی تحریک میں متعدد باتیں مشترک ہیں۔ بنیادی طور پر دونوں طرف یہ تحریکیں اصلاحی تحریکیں تھیں ان دونوں تحریکوں کے ابتدائی رہنما مرد تھے۔ ان میں شریک لوگوں کا تعلق مراعات یافتہ طبقات سے تھا اور یہ تحریکیں بنیادی طور پر دوسری سیاسی تحریکوں سے منسلک تھیں۔ نسائیت کی تحریک کے ارتقا کا جائزہ لیا جائے تو اس کو چار مدارج میں بانٹا جا سکتا ہے جن کو ہم اصلاحی نسائیت، لبرل نسائیت، مارکسی نسائیت اور انقلابی نسائیت کہہ سکتے ہیں۔(۱۲)

تنویر انجم ہی کا ایک مضمون "ٹیڑھی لکیر" کے عنوان سے اس کتاب میں شامل ہے۔ اس مضمون میں عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان کے خیال میں فن ناول نگاری کے اعتبار سے یہ کوئی بڑا یا اچھا ناول نہیں ہے اس لحاظ سے قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور اور الطاف فاطمہ کے ناول بہت بہتر ہیں اور خود عصمت چغتائی کا "معصومہ" لاجواب ہے۔ ٹیڑھی لکیر ایک لڑکی کی زندگی کی کہانی ہے جو اس کی پیدائش سے لے کر اس کے ماں بننے تک محدود ہے۔ اس سفر میں جو لوگ بھی اس کے ہم سفر بنتے ہیں وہ کچھ دور اس کے ساتھ چلتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں۔ اس طرح یہ ناول اس کی تنہائی اور اس کے خلاف اس کی تکلیف دہ اور انتھک جدوجہد کی داستان ہے۔ تنویر انجم اس ناول کے متعلق خیال کرتی ہیں کہ ٹیڑھی لکیر ایک ناول سے زیادہ عصمت چغتائی کا اپنے قاری کے ساتھ ایک مکالمہ ہے جو شمن کے کردار کے ذریعے بہت سے موضوعات پر جاری رہتا ہے۔ عورت کی زندگی کے متعدد پہلوؤں پر مباحثے میں مختلف کردار آتے ہیں اور شمن کو نسائی شعور اور نسائی جدوجہد کی نئی جہات سے روشناس کرتے ہیں۔ کبھی اپنے پیار سے، کبھی نفرت سے اور کبھی دھوکوں سے۔ ہندوستان کے درمیانے طبقے کے پس منظر سے ابھرنے والی یہ آزاد عورت جس کی تخلیق نصف صدی سے بھی قبل ہوئی تھی۔ نوال السعدوی، لیلیٰ ابو زید اور ہتیل عدنان کے تخلیق

کردہ نسبتاً نئے نسوانی کرداروں سے حد درجہ مماثلت رکھتی ہے اور ان عورتوں کی نمائندہ ہے جن کی زندگیوں کو روندنا اس لیے مشکل ہے کہ وہ سیدھی نہیں بلکہ ٹیڑھی لکیر کی طرح ہیں۔(۱۳)

خاموشی کی آواز میں شامل فاطمہ حسن کا اپنا مضمون "نسائی ادب اور تنقید "نسائی تنقید کی متنوع جہات کو واضح کرتا ہے۔وہ نسائی تنقید کے متعلق اپنے نظریات میں لکھتی ہیں کہ نسائی ادب کا مطالعہ دراصل نسائی احساسات و شعور کا مطالعہ ہے۔وہ احساسات وشعور جو بحیثیت فرد ایک خاتون لکھنے والی کو مرد لکھنے والے سے جدا کرتے ہیں۔یہ کیسے ممکن ہے کہ تاریخی، سماجی، اور نفسیاتی عوامل تحریر و تخلیق پر اثر انداز نہ ہو رہے ہوں۔ہر تخلیق کا تجزیہ ان ہی اثرات کا تجزیہ ہوتا ہے۔چناں چہ کسی بھی خطے اور عہد کا ادب اس عہد کے معاشرتی رجحانات اور اقدار کا ایسا باطنی رخ بھی پیش کرتا ہے جو تاریخ یا وقائع نگار کی تحریر میں موجود نہیں ہوتا۔یہی رخ ادب کو ممتاز و ارفع کرنے کی ایک وجہ ہے دوسری وجوہات میں جمالیات سر فہرست ہے اس بات کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو خواتین سماجی اقدار سے جو وابستگی رکھتی ہیں وہ مردانہ وابستگی سے مختلف ہے۔خواتین کا جمالیاتی ذوق بھی دوسرے مردوں سے مختلف ہے۔جب ان کی تحریر میں اس کا اظہار ہوتا ہے تو کیا قاری اس ادراک کے بغیر اس کی تفہیم کر سکتا ہے کہ یہ تجربہ یا مشاہدہ یا احساس اس کی ذات سے مختلف ہو سکتا ہے۔(۱۴)

اگر فاطمہ حسن کی اس تحریر میں دیکھا جائے تو وہ عورت کو بطور انفرادی فرد کے متن میں پیش کرنے کی حامی نظر آتی ہیں ان کی تحریر عورت کو اجتماعی کے بجائے انفرادی طور پر دیکھنے کی حمایت کرتی ہے۔وہ کہتی ہیں کہ ہمارے یہاں نسائی ادب اور تنقید پر سنجیدہ توجہ کی بے حد ضرورت ہے کیونکہ جب بھی نسائی ادب پر بات ہوتی ہے فوری طور پر یہ رد عمل سامنے آتا ہے کہ خواتین کے لیے الگ ڈبہ بنایا جارہا ہے۔جس کی کوئی ضرورت نہیں۔دوسرا رد عمل یہ سامنے آتا ہے کہ خواتین کا مسئلہ کیا ہے؟ انھیں یہ سب کچھ تو حاصل ہے۔وہ آخر چاہتی کیا ہیں؟ اور پھر اس بات پر اتفاق کر لیا جاتا ہے کہ نسائی ادب مغرب سے آنے والا فیشن ہے جسے مشرق کی خواتین نے اپنا لیا ہے۔متعصب ناقدین جو کچھ بھی کہیں وہ اس بات کا منطقی جواب نہیں دے سکے کہ نسائی شعور کا مطالعہ کرنے والوں کو کس خانے میں رکھا جائے اور کیا خواتین کی تخلیقات کا مطالعہ اس سماجی اور تاریخی رویوں کو نظر انداز کر کے کیا جا سکتا ہے جو ان کی تحریروں پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں؟ اور ان کی تحریروں کی جانب مرد تنقید نگاروں کے رویوں پر بھی مغرب سے آنے والی تحریکوں نے جب بھیہ ہمارے پورے ادب پر اثر ڈالا ہے، اتنا شدید رد عمل کیوں سامنے نہیں آیا؟ مثلاً ترقی پسندی،

جدیدیت،وجودیت،ساختیات،اور مابعد جدیدیت کی رو کہاں سے آئی؟ اب اگر خواتین مغرب میں لکھی جانے والی نسائی تنقید کو اپنے یہاں ادبی رویوں پر منطبق دیکھ رہی ہیں تو اسے صرف مغرب کی تقلید کہنے کا کیا جواز ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اردو ادب کی تاریخ میں خواتین کا نام نہیں ملتا۔ کیا یہ درست نہیں کہ ادا جعفری کا ذکر صرف یہ کہہ کر کیا جاتا ہے کہ وہ پہلی شاعرہ ہیں جس نے اردو شاعری میں اپنا مقام بنایا، مردانہ ڈبے میں یہ مقام کہاں ہے؟ اس پر خاموشی ہے۔

فاطمہ حسن نسائی ادب کی تاریخ متعین کرنا چاہتی ہیں انھیں اس بات کا ادراک ہے کہ عصر حاضر کی عورت کو اپنے شعور سے واقف ہونا چاہیے اور خاص طور پر ادب میں نسائی شعور کی تاریخ فاطمہ حسن کا خاص میدان ہے۔ ان کے نزدیک نسائی ادب، اردو ادب کا قابل قدر حصہ رہا ہے۔ نسائی شعور کی روایت ہمارے ثقافتی رجحان کی ترجمانی کرتی ہے یہ خواتین کے ادراک و شعور کی آئینہ دار ہے نسائی اظہار کا رویہ تاریخ سے جڑا ہوا ہے۔ نسائی ادب و تنقید نہ تو مغرب کی نقالی ہے نہ اس کا کوئی تصادم ہماری اقدار سے ہے۔ یہ ہماری آبادی کے نصف حصے کی ذہنی و فکری سفر کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔ فاطمہ حسن اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ لکھنے والییہ خواتین نہ سیاستدان ہیں نہ مبلغ یہ وہ خواتین ہیں جو اپنا تشخص برقرار رکھنے کی تگ و دو میں اپنی خاندانی رضائیاں ساتھ لے کر چلیں تھیں مگر صنعتی دور کی تیز روی میں ایسے کٹھن راستے پر نکل آئیں جس نے سارے رنگ دھندلا دیے۔ ان کی کہانی تیسری دنیا کی ہر عورت کی کہانی ہے۔(۱۵)

اردو ادب میں متعدد خواتین نے تقریباً ایک صدی سے نسائی شعور کی تخلیقی و تنقیدی، دونوں سطح کی ترجمانی کی ہے اور اس حوالے سے اردو ادب کسی بھی ترقی یافتہ زبان کے ادب سے کم تر نہیں ہے بلکہ نسائی طرز احساس کی بھرپور نمائندگی ہمارے ادب میں نئی جہت کا اضافہ کر رہی ہے۔ جہاں تک تاریخ ادب اردو کا تعلق ہے مورخین کے لیے خواتین کو نظر انداز کرنا اب ممکن نہیں رہا ہے۔ اس لیے مورخین کو اب تاریخ کو نئے سرے سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

فاطمہ حسن کا نسائی شعور ان کی رپورتاژ "میلے میں گم" میں بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً وہ کہتی ہیں کہ میلے میں خواتین کی اکثریت تھی جو فیسٹیول پر چھائی ہوئی تھی اگرچہ مرد اور لڑکے موجود تھے مگر خواتین کی موجودگی نمایاں تھی۔ اتنی

نمایاں تھی کہ وہ پس منظر میں چلے گئے تھے۔ ادبی منظر نامے کی یہ تبدیلی میرے لیے غیر متوقع نہیں عورتوں کے وقت کا آغاز ہو چکا ہے میری بیٹی انگلی چھوڑ کر چلنا سیکھ گئی ہے۔ یعنی آج کی عورت کی باشعور ہے وہ لگے بندھے معاشرتی رواجوں سے منحرف ہو سکتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان اصولوں کی نفی بھی کر سکتی ہے جن کی وجہ سے وہ سماجی قیدی بن جاتی ہے۔ جیسے فاطمہ حسن لکھتی ہیں۔

میری بیٹی دنیا کے نقشے میں اپنی مرضی کے رنگوں کو بھرنا سیکھ گئی۔(۱۶)

یہی نسوانی شعور صرف ادبی عورت میں نہیں بلکہ پاکستانی معاشرے کی زیادہ تر خواتین میں بیدار ہو چکا ہے۔ اس حوالے سے فاطمہ حسن نے کئی اداریے بھی تحریر کیے ہیں۔ فاطمہ حسن نے اپنے اداریوں میں خواتین تخلیق نگاروں اور ان کے نسائی شعور کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً آپ مارچ ۲۰۱۹ کے اداریے میں لکھتی ہیں کہ ایک وقت تھا کہ تاریخ کے اوراق خواتین کے وجود سے خالی تھے تہذیب و تمدن کو پروان چڑھانے اور زبان و ادب کی ترویجمیں خواتین نے جو اہم کردار ادا کیا ہے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا جاتا تھا پدرسری نظام نے خواتین کو مستور ہی نہیں بلکہ معدوم رکھا ہے ان کی ذہنی صلاحیتوں اور علم و دانش میں بھی کاغذ سیاہ کیے گئےہیں یہ ۱۹۶۰ کی دہائی تھی جب خواتین لکھنے والیوں نے اس رویے کے خلاف آواز اٹھائی شروع کی اور اپنی تحریروں میں نسائی شعور کو اجاگر کیا انہوں نے عورت کی تضحیک و تحقیر کے رویوں کو تنقید کا نشانہ بنایا اور اس بات پر زور دیا کہ مفروضات پر قائم عورت مخالف رویہ کو ترویج دینے والے ادب کا دوبارہ مطالعہ ہونا چاہیے اس طرح انھوں نے بہادری اور ذہنی برتری سے قائم شدہ بیانیے کو نا صرف چیلنج کیا بلکہ یہ بھی بتایا کہ جس عورت کے وجود کو لکھا جاتا رہا ہے وہ سرے سے موجود ہی نہیں اس کے علاوہ خواتین کی تحریروں سے جو مفاہیم نکالے گئے ہیں وہ درست نہیں خواتین اور غیر متعصب تنقید نگاروں نے انھی حقائق پر نسائی تنقید کی بنیاد رکھی۔(۱۷)

اس سلسلے میں فاطمہ حسن مزید نسائی شعور کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ اردو ادب میں خواتین کے ابتدائی رسائل نے اس شعور کو اجاگر کرنے میں بڑا کردار ادا کیا تہذیب النسواں، خاتون اور عصمت میں لکھنے والی خواتین نے اپنی شناخت پیدا کی مولانا حالی نے اپنے مضمون معاشرے کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے میں اس بات پر زور دیا کہ خواتین کی تعلیم غلط رسوم کے خاتمے کے لیے ضروری ہے ان کی ہم عصر زاہدہ خاتون شیروانیہ نے اقبال کے شکوے کے انداز

میں مثنوی آئینہ حرم لکھی جو ۱۹۱۵ میں مولوی ممتاز علی نے دارالاشاعت پنجاب سے شائع کروائی اقبال کے شکوے کے انداز میں لکھی ہوئی ۶۰ بند کی اس مثنوی میں برصغیر کے مردوں سے شکوہ کیا گیا کہ وہ خواتین کو جاہل رکھ کر ان پر اور اپنی نسل پر کتنا ظلم کر رہے ہیں اور بعد میں جدیدیت کے زیر اثر رکھنے والیاں سماج میں رائج عورت مخالف رسوم رواج کے خلاف ہم آواز رہیں جن میں رشید جہاں، عصمت چغتائی، اور قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور خالدہ حسین نمایاں ہیں۔(۱۸)

۱۹۷۵ء میں جب خواتین کا عالمی سال منایا گیا تو پاکستان کی اہم خواتین اپنے اظہار کی سمت متعین کرنے کے لیے باقاعدہ ایک راہ اختیار کی ان میں کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور زاہدہ حنا شامل ہیں انھوں نے اردو ادب کو نسائی تحریک عالمی منظر نامے سے منسلک کیا بعد میں مرد لکھنے والے بھی اس کارواں میں شامل ہو گئے اب جبکہ نسائی شعور کو نسائی تنقید کی بنیاد تسلیم کر لیا گیا ہے تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس کے اثرات پورے پاکستانی ادب پر کس حد تک مرتب ہوئے ؟ یہ بات خوش آئند ہیں کہ آئندہ نئی نسل میں لڑکیوں کی بڑی تعداد تعلیم کے میدان میں مقام پیدا کر رہیہے اور یہ شعور رکھتی ہے کہ بحیثیت انسان وہ نہ کمتر ہے اور نہ برتر۔ ان کے ہمعصر مرد بھی بڑی حد تک نفی کے رویے سے نکل آئے ہیں اور انھیں اپنے ہم پایہ تسلیم کر رہے ہیں یہ ایک طویل اور مشکل سفر تھا جو ہماری بہت اہم لکھنے والوں نے ممکن بنایا۔ ان خواتین کے نسائی شعور کو کے ذریعے دراصل فاطمہ حسن ان عورتوں کی معاشرے میں بطور فرد ان کی اہمیت اور ان کردار کو پیش کر رہی ہیں۔

ان کی کتاب "بلوچستان کا ادب اور خواتین" ہے جس میں اس کتاب کا مقصد بلوچ سماج میں عورت کے مکمل انسانی روپ کو سامنے لانا ہے سماج میں طبقاتی نسلی اور صنفی سطح پر جو ناانصافی کی جاتی ہے اس کی اصلاح ضروری ہے۔ اس کتاب میں نسائی شعور کا عنصر سامنے آتا ہے سماج نے عورتوں کو جن انسانی حقوق سے محروم رکھا وہ انھیں دیے جاسکتے ہیں سماج میں مثبت تبدیلی بھی لائی جاسکتی ہے بلوچستان کی خواتین بھی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ادب کی بدولت ہی کرتی ہیں جن کو فاطمہ حسن نے اپنی کتاب میں سامنے لایا ہے ان خواتین میں رابعہ خضداری اور اجالا مینگل وغیرہ جیسی خواتین کی فکر عورت کی صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔(۱۹)

فاطمہ حسن نے اپنی کتاب "فیمنزم اور ہم" میں عورت کی بطور فرد انفرادی شناخت پر بہت زور دیا ہے ان کی یہ کتاب دراصل فیمنزم کی تعریف نوعیت کو سمجھنے اور معاشرے میں مثبت تبدیلی، خواتین کی موجودہ جدوجہد کو سمجھنے اور ان کی قدر کرنے کے حوالے سے اہم مضامین شامل ہے ان میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جنہیں ماضی میں بہت سے لوگ فراموش کر چکے ہیں یا نادانستہ مسخ کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ اس کتاب میں اٹھارہ مضامین شامل ہیں۔ جو نسائی ادب کی تاریخ متعین کرتے ہیں۔

فاطمہ حسن فیمنزم کے حوالے سے کہتی ہیں

آج دنیا کی نسائی تحریک میں فعال خواتین فیمنزم کی تعریف ان الفاظ میں
کر رہی ہیں کہ اس بات کو تسلیم کرنا کہ سماج میں خواتین کے ساتھ
امتیازی سلوک کیا جاتا ہے اس رویے کو تبدیل کرنے کے لیے
مثبت کردار ادا کرنا ہی فیمنزم ہے۔(۲۰)

فاطمہ حسن نے اس کتاب میں گزشتہ صدی سے عہد حاضر تک اردو ادب میں نسائی شعور کے متعلق مضامین تحریر کیے ہیں جس میں انھوں نے خواتین کی تخلیقی صلاحیتوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس صدی میں خواتین نے جو ادب تخلیق کیا اور اس کا اردو ادب پر جو اثر پڑا اس کو فاطمہ حسن نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ بر صغیر کے سماجی نظام میں یہ گنجائش کم تھی کہ خواتین تخلیقی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کر سکیں لیکن ان واقعات کے باعث بھی خواتین نے محنت کے ساتھ جو ادب تخلیق کیا اسے نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ فاطمہ حسن نے نسائیت کے حوالے سے اردو ادب کو فروغ دینے اور روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا جس کی وجہ سے ان کی شخصیت کو فیمنسٹ کہا جا سکتا ہے۔

یہ کتاب نسائی تنقید کی ترجمان ہے۔ جس میں انھوں نے فیمنسٹ اردو ادب کا انتخاب کیا ہے آج دنیا بھر میں خواتین اس بات پر متفق ہیں کہ صدیوں سے انھیں نامساوی سلوک اور تضحیک کا نشانہ بنایا گیا بہ حیثیت انسان انھیں کم تر جانا گیا۔ انھیں ذہانت، فکر، دانش، علم و عقل سے عاری مخلوق ثابت کیا گیا تہذیب و تمدن کی تاریخ سے عورت کا وجود ہی

غائب ہے اس منفی رویے کو تبدیل کرنا اور ایسے سماجی ایجنڈے پر تنقید کرنا جو غیر مساوی سلوک کو تقویت دے فیمنزم ہے۔

فاطمہ حسن نے اس کتاب میں جتنے مضامین اکٹھے کیے وہ پاکستانی سماج میں عورت کی حیثیت پر سوال اٹھاتے ہیں۔ انیس ہارون اپنے مضمون "فیمنزم اور پاکستانی عورت" میں لکھتی ہیں کہ پاکستان میں عورتوں کی جدوجہد بڑے ابتدائی مراحل میں ہے۔ یہاں تو فیمنزم زندگی کے بنیادی حقوق مثلاً زندہ رہنے کا حق، تعلیم کا حق، آمدورفت پر پابندی نہ ہونے، اپنی مرضی کا پیشہ اختیار کرنے، پسند کی شادی کرنے اور بحیثیت انسان معاشرے میں پہچانے جانے کا حق مانگ رہا ہے اور تعلیم صحت ملازمت اور سماجی حقوق میں مردوں سے کہیں کم ہے اور اپنی زندگی کے فیصلوں پر اس کا کوئی اختیار نہیں۔ غیرت کے نام پر قتل، عورت کی خرید و فروخت، وٹہ سٹہ اور کم عمری کی شادی، سام رکھنا اور دلور کی رسم بلا روک ٹوک جاری ہے ان کا ختم ہونا عورت کی عزت اور حیثیت بحال کرنے کی طرف پہلا قدم ہو گا۔ (۲۱)

صغرا مہدی اپنے مضمون "تحریک نسواں کے علمبردار خواجہ الطاف حسین حالی" میں لکھتی ہیں کہ جدید خیالات اور نئے زمانے کی آمد سے لوگوں کو سماج میں عورتوں کی ابتر حالت کا احساس ہونا شروع ہوا اور دنیا بھر میں عورتوں کی تعلیم اور آزادی کی تحریک شروع ہوئی۔ انگریزی میں اس کے لیے فیمنزم کا لفظ استعمال ہونے لگا اس کی توجیہات الگ الگ وقتوں، الگ الگ ملکوں میں مختلف تھیں۔ اس کی صاف وجہ یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ان کا تصور بدل گیا ہے اور اس میں وسعت آ گئی۔۔ ہندوستان میں انیسویں صدی میں اس کی ابتداء ہوئی جب مختلف عورتوں کے تعلیم اور آزادی پر زور دیا جانے لگا ان سب رسموں کے خلاف آواز اٹھائی گئی جن کے نام پر عورتوں پر ظلم و ستم ڈھایا جاتا تھا ان میں سب سے بھیانک ستی کی رسم تھی یہ وہ رسم تھی جس کے خلاف حالی نے بہت آواز اٹھائی اور انھوں نے مسلمان بیوہ عورتوں کے حق میں بھی لکھا۔ (۲۲)

فاطمہ حسن نے اپنی کتاب میں انتظار حسین کے ایک مضمون "کہانیوں کی اولین خالق" کا بھی انتخاب کیا ہے۔ نسائی ادب کی تاریخ میں ایسے مضامین بلاشبہ عمدہ کہے جاسکتے ہیں۔ انتظار حسین کہتے ہیں کہ میں تو یہ سمجھنے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہمارے معاشرے اور ہماری روایت میں کم از کم ایک روایت ایسی ہے جس سے آزادی کی طلب رکھنے والی بیبیوں کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارے ادب میں شاعری کی روایت بیشک مردانہ ہے شاعرات تو

اس روایت میں اب نمایاں ہیں مگر ہمارے فکشن کی روایت ملی جلی ہے یعنی مردانہ رنگ کے ساتھ ساتھ بلکہ کبھی کبھی سے بڑھ کر اس میں نسوانی عمل دخل نظر آتا ہے۔ ہماری شعری روایت اور افسانوی روایت میں فرق ہے۔(۲۳)

فاطمہ حسن کی اس مرتب کتاب میں سب سے اہم مضمون فہمیدہ ریاض کا "فیمنزم اور ہم" ہیں اسی مضمون کی مناسبت سے کتاب کا نام بھی منتخب کیا گیا ہے۔ فہمیدہ ریاض لکھتی ہیں کہ

فیمنزم ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا مطلب لوگ اپنی طرح سے سمجھتے رہے ہیں
مگر میں نے جب بھی استعمال کیا ہے یا یہ کہا ہے کہ میں فیمنسٹ ہوں تو ہر بار
میرے ذہن میں اس کا مطلب یہی رہا ہے کہ عورت کے مکمل انسانی وجود
کو تسلیم کیا جائے اور اس کی کسی بھی پہلو کو کچل کر نابود کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔(۲۴)

جب معاشرہ عورت کی عقل و دانش کی نفی کرتا ہے تو اسے فیصلہ سازی میں شامل نہیں کرتا۔ اسے اختیارات نہیں دیتا۔ ایسے سماج میں عورت کی حیثیت بھیڑ بکریوں اور گایوں جیسی ہوتی ہے جن کو انسان کچھ فائدہ اٹھانے کے لیے پالتا ضرور ہے لیکن انھیں وہ اپنے جیسا نہیں سمجھ سکتا اور نہ ان سے برابری کا سلوک کر سکتا ہے۔

فاطمہ حسن برصغیر کے سماج میں عورت کی حیثیت اور تاریخی شواہد سے یہاں عورتوں کی زندگیوں کے نمایاں کارناموں پر روشنی ڈالتی ہیں ایک ہزار برس سے برصغیر کے مسلمانوں کے ان زیریں طبقات میں عورت کی حیثیت اس رتبے اور قبولیت کا عکس رہی ہے جو شاہی اور حاکم طبقات میں مروج تھی۔ اس کی ایک مثال خواتین کی تعلیم ہے جس کے زیادہ مستند تاریخی شواہد ملتے ہیں کہ شہری آبادی میں شرفا اپنی بیٹیوں کو تعلیم دلواتے تھے۔

تاریخ ہمیشہ ایک سیدھے راستے پر سفر نہیں کرتی۔ دورِ حاضر کے آغاز سے مسلم ممالک اور برصغیر کا مسلم معاشرہ جس کشمکش کا شکار ہو گیا ہے اور اس میں عورت کے مکمل انسانی وجود کو تسلیم کرنے اور اس کا احترام کرنے کے خلاف جو مزاحمت نظر آ رہی ہے وہ تاریخ کے کسی ایسے پیچیدہ راستے سے گزر رہی ہے جو ماضی کی بہتر اقدار کی نفی کرتا ہے۔ آج یہ اہم ضرورت ہے کہ ہم اپنے مسلم تشخص کو درست سیاق و سباق میں دیکھ سکیں اور ان چراغوں کو نہ بجھنے دیں جو ہمارے اجداد اور ان بزرگوں نے روشن کیے تھے۔ یہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔

صغرا مہدی اپنے مضمون 'اردو ناول میں عورت کی سماجی حیثیت " کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ابتدا میں جتنے ناول لکھے گئے مجموعی طور پر ان کا موضوع عورت کی سماجی حیثیت ہے اور زیادہ تر ناول اسی لیے لکھے گئے اس میں کوئی شبہ نہیں عورت کی سماجی حالت کو بہتر بنانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا اگر یہ کہا جائے کہ عورتوں کی تعلیم اور آزادی کے لیے مصلحین قوم کی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہوتیں اگر یہ مقبول ناول عورت کی حیثیت کی کوشش نہ کرتے اگر ان تمام ناولوں کا مطالعہ کیا جائے تو عورت کی سماجی حیثیت کو بیان کیا جاسکتا ہے۔(۲۵)

فاطمہ حسن نسائی شعور کے بارے میں کہتی ہیں کہ برصغیر کے سماجی نظام میں یہ گنجائش بہت کم تھی کہ خواتین تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کر سکیں پھر بھی اس صدی کے دوران انھوں نے جو ادب تخلیق کیا اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا اس میں خواتین نے جو ادب تخلیق کیا وہ اردو ادب کے ورثے میں بہت اہم اور باوقار اضافہ ہے اس کے ذریعے سے تخلیقی اظہار کی کچھ ایسی جہات سامنے آئی ہیں جن کی وجہ سے ان کا خصوصی مطالعہ کرنا چاہیے۔

بیدی کی تحریروں کے متعلق فاطمہ حسن کہتی ہیں کہ بیدی اپنی کہانیوں میں عورت کے ساتھ زیادتی پر نالاں اور گریہ کناں نظر آتے ہیں وہ ساری زندگی بچے پیدا کرنے کی مشقت سہتی اور ان کی پرورش کرتی ہے۔ لیکن معاشرہ اس کے ساتھ اچھا سلوک روا نہیں رکھتا اس کے ساتھ سماجی رویے ظالمانہ ہیں اس کی ضرورتوں اور آرام کا خیال نہیں رکھا جاتا تاہم وہ عورت کو اس صورتحال سے علیحدہ ایک ایسے مکمل انسانی وجود میں دیکھتے ہیں جہاں وہ بچوں اور گھر کے پردے میں چھپی اس سیاست کو آشکار کریں جو مردوں نے اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے بڑی مہارت سے ایک ایسا نظام وجود میں لانے کے لیے چلی ہے جس میں صرف ایک کمزور مہرہ ہے وہ اقدار اور روایات جو پدر سری معاشرے تشکیل دیے ہیں اور جس میں عورت کا وجود بحیثیت باشعور انسان کہیں بھی نہیں ہے اس کے احساسات جذبات تو کیا اس کے وجود کا ہونا بھی اتنا ہی جیسے تجھے کسی پالتو جانور کا۔ بیدی یہ تلخ حقائق اپنی تحریروں میں پیش کرتے ہیں۔(۲۶)

فاطمہ حسن سیاسی، سماجی اور ادبی تحقیق میں ایک منفرد نام رکھتی ہیں ان کی ایک اہم تحقیق ز۔خ۔ش (زاہدہ خاتون شروانیہ) کے حوالے سے ہے۔ ان کا یہ مقالہ جو ان کا پی ایچ ڈی کا تھیسز بھی ہے اور ۲۰۰۷ء میں یہ انجمن ترقی اردو سے کتابی صورت میں شائع بھی ہوا۔(۲۷) یہ عورت کے انفرادی تشخص کے حوالے سے ان کے شعور کا غماض ہے ۔فاطمہ حسن تاریخ کے بوسیدہ اوراق میں عورت کی سسکیوں کو منظر عام پر لائی ہیں اس مقالے میں ان کا نسائی شعور

سب سے زیادہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ فاطمہ حسن کی یہ کتاب ظاہر کرتی ہے کہ وہ خواتین کے پوشیدہ متون کی بازیافت اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو سامنے لانا چاہتی ہیں۔ انھوں نے زاہدہ خاتون کے تقریباً تمام تر تخلیقی ورثے کو نہ صرف محفوظ کیا ہے بلکہ ان کے خطوط کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا ہے۔

فاطمہ حسن نے زاہدہ خاتون کی زندگی کے ہر گوشے تک ممکنہ رسائی کی۔ زاہدہ خاتون کی شاعری میں موضوعات کا تنوع ہے ان کے ہاں عصری شعور و مسائل سے ہم آہنگی اور نسائی شعور کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ یہ وہ پہلی خاتون شاعرہ ہیں جو اپنی منفرد طرز کلام کی وجہ سے انفرادیت کی حامل ہیں۔ جنھیں نہ تو نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی عام الفاظ میں ان کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ زاہدہ خاتون کو کم عمری میں ہی برصغیر کے سیاسی و سماجی مسائل کا ادراک کرنے لگی تھیں۔ ان کو حصول علم کی تو اجازت ملی مگر اظہار کی اجازت میسر نہیں تھی جو ان جیسی علمی و ادبی فرد کو ملنی چاہیے تھی۔ جس کی وجہ سے انھوں نے ہمیشہ اپنی شناخت پوشیدہ رکھی۔ (۲۸)

فاطمہ حسن نے زاہدہ خاتون کی شناخت نہ صرف بحیثیت ایک ادیب کے کروائی بلکہ ان کی پہچان ایک ایسی عورت کے طور پر بھی کروائی جو اپنے عہد کی توانا آواز تھی۔ حالانکہ والد کی نافرمانی کا خوف، پہچان کا خوف، سماج کے رد عمل کی مختلف صورتیں اور کم اندیش جاہل لوگوں سے تحفظ، اور بہت سے دوسرے مسائل کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنا نام بدلتی رہیں۔ حالانکہ وہ صاحب اسلوب شاعرہ تھیں۔ ان کی ایک نظم "فردوس تخیل" میں تاریخی و سماجی شعور، حالات حاضرہ سے وابستگی، اور قومی زبوں حالی کا دکھ، مؤثر اظہار اور زبان و بیان پر مکمل ادراک کی جھلک نمایاں ہے۔

ز۔ خ۔ ش برصغیر کی خواتین کے مسائل سے پوری طرح واقف تھیں۔ اس وقت عورتوں پر تعلیم حاصل کرنے کی پابندی تھی۔ دوسری جانب مجموعی طور پر مسلمان قوم مختلف مسائل سے دوچار تھی۔ ان حالات میں عورت کو پسماندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس حوالے سے اوائل عمری سے ہی زاہدہ خاتون شروانیہ نے عورتوں کی بہبود کے لیے کام شروع کر دیا۔ اور اپنی شاعری کی بدولت خواتین کو بیدار کرنے کے لیے بار بار اپنے خیالات کا اظہار کرتی رہیں۔ وہ کہتی رہیں کہ عورت پر ترقی کی راہیں مسدود کر دی گئی ہیں اور سماج نے ان سے عورت ہونے کا حق بھی چھین لیا ہے ۔ جو سراسر ناانصافی ہے۔ زاہدہ خاتون نسائیت میں اہم کردار ادا کرتی رہیں اور عورت بیداری میں ان کی شاعری معاون رہی۔

انھوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور نثر کو بھی اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا، لیکن ان کے تخلیقی صلاحیت کا بھرپور احساس ان کی نظمیہ شاعری میں نمایاں ہے۔ ان کا تاریخی اور تہذیبی شعور انتہائی پختہ ہے۔ ان کو اسلامی اقدار و روایات سے قلبی لگاؤ ہے، جس کا احساس ان کی نظموں کی پڑھت سے ہوتا ہے۔ ان کے یہاں مضامین کا تنوع بھی ہے، عصری شعور اور عصری مسائل و موضوعات سے ہم آہنگی بھی ان کی نظموں میں نظر آتی ہے۔ ان کی نظمیہ شاعری میں نسائیت اور نسائی شعور کا بھرپور اظہار بھی ملتا ہے۔ زاہدہ خاتون شروانیہ اغلباً اردو کی پہلی شاعرہ ہیں جو اپنی مثبت فکر اور منفرد طرز ادا کی وجہ سے اتنی نمایاں ہیں کہ انھیں نہ تو نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان کا عام ذکر کر کے گزرا جاسکتا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں ان کی تاریخی نظموں نے بے انتہا مقبولیت حاصل کی۔

فاطمہ حسن نے اس کتاب میں بڑی باریک بینی سے ز۔خ۔ش کے عہد کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے برصغیر کے اولین سماج کا مطالعہ کیا ہے اس مطالعے میں انھوں نے عصری مسائل کا احاطہ بھی کیا ہے۔ زاہدہ خاتون کے عہد میں برصغیر کے سیاسی، سماجی، تعلیمی حالات بہت خراب تھے۔ برصغیر کے عہد میں سماج نے عورت کے لیے جو رویہ اختیار کیا وہ غلامی کی ایک قسم تصور کیا جاسکتا ہے۔ عورتوں کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی تھی۔ نیچی نظر، اور خاموش زبان ایک آئیڈیل عورت کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ ایسے معاشرے میں زاہدہ خاتون نے اپنی سماجی اور جبری پابندیوں کی گھٹن کا اظہار اپنی تخلیقات میں کیا ہے۔ انھوں نے عورتوں پر سلسلہ وار لکھنا شروع کیا۔ مسلسل کئی نظمیں تحریر کیں جن میں خواتین کی تعلیم، ان میں فکر و تدبر، ذہنی و سماجی اور سیاسی و معاشی بیداری کی حمایت پر مبنی تھے۔ زاہدہ خاتون مسلسل اپنی تحریروں میں عورت کے حقوق کی بات کرتی رہیں۔

زاہدہ خاتون کو بہ حیثیت ایک انفرادی فرد پیش کرنے کے لیے فاطمہ حسن نے ان کی زندگی کے نمایاں واقعات کو سراہا ہے۔ پنجاب میں خواتین کو والدین کی وراثت میں حصہ نہ دیے جانے کے رواج کو قانون کی حیثیت سے منظور کروانے کی کوشش جاری تھی۔ جس میں کونسل کے چند مسلمان اراکین بھی شامل ہو گئے تھے۔ برصغیر کے عہد میں سماج میں صنفی امتیاز پر مبنی تمام رسومات عورتوں کے مخالف تھیں۔ جس کی وجہ سے برصغیر کا عہد تاریکی کا عہد کہلاتا ہے۔ عورتوں کے حقوق کے ضمن میں مردانہ رویے معاندانہ خود غرضی پر مبنی ہیں۔ زاہدہ خاتون کے خطوط میں بھی صنفی امتیاز پر مبنی رویے، رسومات پر شدید نکتہ چینی نظر آتی ہے۔ خواتین کی حالت زار پر انھوں نے ۱۹۱۵ء میں ایک مثنوی "آئینہ حرم" کے نام سے لکھی۔ زاہدہ خاتون نے سودیشی تحریک میں حصہ لیا۔ ملت اسلامیہ کی سربلندی،

مظلوم خواتین کی حمایت، خواتین کی بیداری، سودیشی تحریک، ہندو مسلم اتحاد، اخبارات وجرائد پر پابندی اور دوسرے بہت سارے موضوعات ان کی نظموں اور نثری تخلیقات کو موضوع بنتے رہے ہیں۔ زاہدہ خاتون شروانیہ اس عہد کی ایک باشعور شاعرہ کے طور پر اپنے عصر کو پیش کر رہی ہیں۔ جو علم و تدبر، احساس اعلیٰ اقدار، کے ترجمان کے طور پر نظر آتی ہیں۔ فاطمہ حسن نے زاہدہ خاتون کے عہد کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کیا۔ اس دور کو تحقیقی صورت میں سامنے لانا اور زاہدہ کے نسائی شعور کی ترجمانی کا عمدہ کام فاطمہ حسن نے سرانجام دیا۔

فاطمہ حسن نے نہ صرف زاہدہ خاتون کے عہد کو پیش کیا بلکہ انھوں نے اس کتاب کے دوسرے باب میں برصغیر میں عورت کی سماجی حیثیت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ انیسویں صدی کے اختتام تک برصغیر میں خواتین کی تعلیمی حالت نہایت بری تھی اور خواتین زیادہ تر جہالت کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی نہ صرف خواتین بلکہ مرد بھی جدید ترین تعلیم کے حصول سے قاصر تھے مسلمان ایک طرف انگریزی تعلیم کے حصول کو بری نگاہ سے دیکھتے تھے تو دوسری طرف سے اپنے مذہب اور اقتدار سے الگ بھی سمجھتے تھے۔ لیکن ان سب حالات میں زخ ش نے عمدہ دہ کاوش کی اور تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے شیخ عبداللہ کے قائم کردہ سکول علی گڑھ کی مالی مدد بھی کی۔ وہ بہت روشن دماغ خاتون تھیں اور خواتین کی تعلیم پر بہت دلچسپی لیتی تھیں۔

برصغیر میں تعلیم کے لیے اور بالخصوص عورتوں کی تعلیم کے لیے جتنی خواتین نے توجہ دی زاہدہ خاتون نے ان سب پر لکھا۔ ان سب خواتین کی عظمت اور بہادری کا بار بار ذکر کیا ہے۔ یہی دور زاہدہ خاتون کی فکری اظہار کے عروج کا دور ہے انہوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔ ہر صنف نظم و نثر دونوں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام میں خاصی دلچسپی لی ان کی منظوم اپیل جو یونیورسٹی کے چندے کے لیے لکھی تھی ماہنامہ عصمت میں شائع ہوئی۔ (۲۹)

برصغیر کا ابتدائی معاشرہ عورت کے حوالے سے کافی پسماندہ سوچ رکھتا تھا۔ اسی لیے ابتدائی نسائی ناول کے بارے میں فاطمہ حسن نے بڑی باریک بینی سے معاصر حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اس عہد کے حالات کو پیش کیا ہے۔ علی گڑھ تحریک سے وابستہ کئی ہم عصروں نے خواتین کی تعلیمی ترقی، پسماندگی کو دور کرنے اور علم کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی بات کی۔ اس عہد کے مصنفین نے خواتین کی بیداری کے لیے کئی تخلیقات لکھیں جو فکری ارتقا کا سبب بنیں۔ ان

مصنفین کی تصانیف نہ صرف نسائی تعلیم کے لیے محرک بنیں بلکہ لکھنے والوں نے ان سے متاثر ہو کر تصنیف و تالیف کا کام بھی شروع کر دیا۔ اسی لیے اردو کے ابتدائی نسائی ناول اس دور کے مسلم معاشرے کی تعلیمی اور سماجی حالت کے آئینہ دار ہیں۔

برصغیر میں پڑھی لکھی خواتین بھی اپنا اظہار کرنے سے محروم رہیں۔ سماجی نظام اور معاشرتی رویوں کی بدولت ان کا گھر سے نکلنا تو محال تھا ہی، لیکن لکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جس سے وہ اپنی تخلیقات کو ظاہر کر سکیں۔ جب برصغیر میں نسائی تعلیمی تحریک کا آغاز ہوا تو ساتھ ساتھ خواتین رسائل میں اپنی تخلیقات چھپواتی رہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں چند پڑھی لکھی خواتین اپنی تخلیقات کو منظر عام پر لاتی رہیں جن کا واحد ذریعہ رسائل تھا۔ تعلیمی تحریکوں کا فوری اثر یہ ہوا کہ یہ رسائل شائع ہونے لگے۔ جو افراد خواتین کی تعلیم کے حامی تھے وہ نسائی تعلیم کی تحریک کو فروغ دینے کا واحد اور مؤثر ذریعہ ان رسالوں کو ہی سمجھتے تھے۔ انھی کی کوششوں کی بدولت خواتین کو اپنی تحریریں اور تخلیقات کو زنانہ رسائل میں بھیجنے کا حوصلہ ملا۔ جنھوں نے تعلیم حاصل کر لی تھی مگر خط و کتابت کی اجازت انھیں نہ ملی اس وقت برصغیر میں لڑکیوں کو غیر محرم فرد سے تحریری رابطہ کرنے کی بھی ممانعت تھی۔ اس امر کو شرمناک اور خاندان کی عزت پر حرف آنے کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ان رسائل کے اجرا سے یہ فائدہ ہوا کہ مسلم خاندان کی لڑکیاں اور خواتین اپنے ناموں کو ظاہر کیے بغیر اپنی تحریریں رسائل کو بھیجنے لگیں۔ ان خواتین میں زاہدہ خاتون شیر انیہ بھی ہیں جن کے متعلق فاطمہ حسن نے تفصیلی تحریر کیا ہے اور ان کو بیان کرنے کے لیے انھوں نے اس عہد کی خواتین کی انفرادی کردار یت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری دس برس تک رسائل و اخبارات میں چھپتی رہی۔ اس شاعری کا مفصل جائزہ لیا جائے تو زاہدہ خاتون کی صلاحیتیں بطور انفرادی فرد کے ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔

زاہدہ خاتون نے خواتین کو ان کے روایتی کردار سے ہٹ کر پسماندگی کے خاتمے کے لیے حصول علم اور میدان عمل آنے کی تلقین کرتی رہیں۔ ان کے خیال میں اس سب کے لیے سب سے ضروری علم کا حصول ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے مضامین، روزنامچے اور ذاتی زندگی میں بھی خواتین کو حصول تعلیم پر زور دیتی رہیں اور پسماندگی کے خلاف آواز اٹھاتی رہیں۔ سماج کے متنوع رویوں کے متعلق بھی انھوں نے لکھا اور انھوں نے مذہب و شرع کے حوالے سے

بھی اس بات کو اجاگر کیا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے خواتین کے بارے میں غلط رویہ اختیار کیے رکھا ہے۔ جو اسلام کے عین مطابق نہیں ہے۔ اور اسلام کے منافی عمل ہے۔ ان کے نزدیک اسلام واحد مذہب ہے جو خواتین کی عزت کا درس دیتا ہے۔ برصغیر کے مسلمان مذہب اسلام کی تعلیمات کے خلاف کام کرتے ہیں۔ مسلمان پیغمبر اسلام کی تعلیمات سے غافل ہیں۔

نسائی شعور اور خواتین کے انفرادی شعور کے متعلق فاطمہ حسن نے اہم کردار ادا کیا اور سماجی کاموں میں پیش پیش رہیں۔ انھوں نے ملازمت وزراعت پیشہ خواتین کے لیے فکری، تحریری طور پر جو کچھ بھی کر سکتی تھیں، کرتی رہی ہیں۔ نسائی ادب کے حوالے سے ان کی کتاب اردو شاعرات اور نسائی شعور سو برس کا سفر (۲۰۲۲-۱۹۲۰) بہت اہم ہے۔ اس کتاب میں فاطمہ حسن نے ایک باشعور عورت، ایک شاعرہ اور اردو ادب کی ایک عالم کی حیثیت سے انھوں نے جس عزم، لگن اور مستقل مزاجی سے کام کیا ہے۔ (۳۰)

اس کتاب کے پہلے باب میں تاریخ اردو ادب میں عورت کی عدم موجودگی سے آغاز کرتے ہوئے متعدد صنفی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں بتایا گیا ہے کہ ادبی تاریخ میں نسوانیت کی عدم موجودگی اور پدرسری معاشرے کے مستحکم نظام اور جبر و تشدد کا اظہار ملتا ہے۔ تہذیب کے ارتقا میں عورت کے کردار کو بہت نظر انداز کیا گیا ہے، فنون کی تخلیق میں اس کی فطری خدمات کے اعتراف کا فقدان رہا ہے۔ یہ عمومی رویہ اردو ادب کے تاریخ نویسوں کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔ ادب و فن میں عورت کی منفی تصویر کشی، اس کے ظاہری خدوخال پر زور اور باطنی وجود سے روگردانی بھی مردانہ تعصب اور عورت کو ایک شے سمجھنے کی کوشش کا اظہار ہے۔ یہ رویہ ادیبوں اور شاعروں کی عورت نفرت کا اظہار ہے۔ لیکن آج تمام علوم وفنون میں عورت کے بھرپور کردار کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا۔ آج جس قوت سے زندگی کے ہر شعبے میں عورت کی ذہنی و تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار موجود ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ ماضی میں یہ عدم موجودگی، صنفی امتیاز اور صریح تشدد پر مبنی تھی۔

فاطمہ حسن کہتی ہیں کہ اردو ادب میں نسائی آواز کی شمولیت کو سو برس ہونے کو آئے ہیں اور یہ آواز آج خاصی بلند آہنگ محسوس ہوتی ہے یہ وقت کا تقاضا ہے کہ اب تنقید میں خواتین کے شعر و ادب کا جائزہ لینا چاہیے اسی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے فاطمہ حسن نے یہ کتاب مرتب کی ہے اس لیے کہ مرد ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کا خواتین کی

تحریروں کے بارے میں منفی رویہ رہا ہے۔فاطمہ حسن نے اس کتاب کے ذریعے اردو شاعرات اور نسائی شعور میں ایک اہم اور قابل ستائش قدم اٹھایا ہے یہ کتاب وقت کی ضرورت تھی جسے فاطمہ حسن نے پورا کیا ہے۔(۳۱)

فاطمہ حسن نے اس کتاب میں نسائی شعور اور اردو ادب کے تعلق سے مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے نسائی شعور سے بہرہ مند تنقید نگار خواتین و حضرات کی کوششوں پر روشنی بھی ڈالی ہے۔فاطمہ حسن نے تانیثیت پسند مرد نقادوں جیسے کہ گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، آصف فرخی، ضمیر علی بدایونی، شاہ محمد مری اور بادشاہ منیر بخاری کی کاوشوں کا اعتراف ملتا ہے وہیں اردو تنقید کو نسائی شعور سے متصف کرنے والی خواتین مثلاً کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، زاہدہ حنا، خالدہ حسین، شاہدہ حسن اور تنویر انجم کے تنقیدی مضامین کی اہمیت اجاگر کی ہے۔اس کے علاوہ فاطمہ حسن نے اردو ادب کے ہر شعبے میں ان نسائی آوازوں کو بھی زندہ کیا ہے جنھیں تاریخ میں معدوم کر دیا گیا ہے۔ دانستہ طور پر نظر انداز کی جانے والی شاعرات اور فکشن نگار خواتین کی تاریخ کو اس باب میں پیش کر کے مصنفہ نے ایک اہم کام کیا ہے۔

فاطمہ حسن کی خوبی یہ ہے کہ وہ پاکستان اور ہندوستان کے اردو ادبی منظر نامے سے بخوبی آگاہ ہیں۔یہی وجہ ہیں کہ اس کتاب کا دوسرا باب پاکستانی نظم نگار شاعرات کے بارے میں ہیں۔فاطمہ حسن کی اردو شاعری، فکشن اور تنقید پر گہری نظر کی بدولت ہی ان کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ نہ صرف شاعرات کی ایک بڑی تعداد کو متعارف کراتی ہیں بلکہ نسائی شعور کے متنوع موضوعات اور ان کی نظموں کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ان شاعرات میں ز۔خ۔ش، رابعہ پنہاں، بلقیس جمال، خورشید بانو شمع، ادا جعفری، زہرا نگاہ، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، پروین فنا سید، سحاب قزلباش، عرفانہ عزیز، شبنم شکیل، سلطانہ مہر، پروین شاکر، شاہدہ حسن، نسیم سید، نسرین انجم بھٹی، شائستہ حبیب، فاطمہ حسن، عذرا عباس، تنویر انجم، سارا شگفتہ، امر سندھو، عطیہ داؤد، رخشندہ پروین، سدرہ سحر عمران، نجمہ منصور، شاہین مفتی ، منصورہ احمد، فاخرہ بتول، ناہید قاسمی، ثمینہ رفعت، پروین حیدر، ماہ طلعت زاہدی، ثمینہ راجا، یاسمین حمید، حمیدہ شاہین ، عشرت آفرین، رخسانہ صبا، نجمہ عثمان، ثروت زہرا، رشیدہ عیاں، تسنیم عابدی، نجیبہ عارف، ریحانہ روحی، پروین طاہر، نوشی گیلانی، حجاب عباسی، رضیہ سبحان قریشی،، ناصرہ زبیری، نرگس افروز زیدی، فرخ زہرا گیلانی، حمیرا راحت، عنبرین صلاح الدین، صائمہ علی، عنبریں حسیب عنبر، نسیم نازش، سعدیہ حریم، انجم عثمان، رخشندہ نوید، محمودہ غازیہ، یاسمین حبیب، ریحانہ احسان، ناہید قمر، خالدہ عظمیٰ، نوشابہ نرگس، فرزانہ نیناں، فرحت پروین، بشریٰ فرخ، فوقیہ

مشتاق، گل ناز کوثر، شائستہ مفتی، قندیل بدر، سیما غزل، جہاں آرا تبسم شامل ہیں۔ فاطمہ حسن سو برس کے نسائی شاعری کے مطالعے کا آغاز ۱۸۹۴ء میں پیدا ہونے والی زاہدہ خاتون شروانیہ سے کیا ہے اور اسے ۲۰۲۰ء تک شائع شدہ مجموعوں کی شاعرات تک لائی ہیں۔ پچھتر نظم نگار پاکستانی شاعرات کی مکمل نظموں کو مثالوں میں پیش کر کے ان پر تبصرہ کیا ہے۔ اس طرح ان نظموں میں شامل تانیثی شعور کے مختلف موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔ اس کتاب کو تذکرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ اس نسائی شعور کی تاریخ ہے جس کا حصول پچھلے سو برس میں خواتین کے لیے ممکن ہوا ہے اور اردو شاعرات نے بڑی جرات مندی سے اس کا اظہار کیا ہے۔ یہ کتاب ایک ایسی دستاویز بھی ہے کہ جس میں نسائی شعور کی روشنی سے منور موضوعات کے لا محدود تنوع کا تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ فاطمہ حسن نے جہاں شاعرات کے انتخاب میں ذہانت کا اظہار کیا ہے وہیں ان کا ان شاعرات کی منظومات اور غزلوں کا انتخاب بھی شاندار ہے۔ ان نظموں کے متنوع موضوعات کا بصیرت افروز جائزہ بھی فاطمہ حسن کی تخلیق بھی موجود ہے۔

اس کتاب کا تیسرا باب ہندوستانی اردو شاعرات کے تعارف، نظموں اور ان کے تجزیوں پر مشتمل ہے۔ ان شاعرات میں شفیق فاطمہ شعریٰ، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، رفیعہ شبنم عابدی، نور جہاں ثروت، بلقیس ظفر الحسن، شہناز نبی، شائستہ یوسف، ترنم ریاض، نسیم نکہت، عذرا پروین، شبنم عشائی، فوزیہ فاروقی اور کہکشاں تبسم شامل ہیں۔ اس باب میں فاطمہ حسن ہندوستانی خواتین شاعرات کو نہ صرف پاکستانی قارئین سے متعارف کراتی ہیں بلکہ ان کے نظمیہ اظہار میں نسائی شعور کے مختلف پہلوؤں پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ اور ہندوستانی عورتوں کی نسائیت کو سامنے لائی ہیں۔

اس کتاب کا اگلا باب غزل گو شاعرات سے متعلق ہے۔ جس میں ادا جعفری، خورشید بانو شمع، رابعہ پنہاں، زہرا نگاہ، پروین فنا سید، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، عرفانہ عزیز، صدیقہ شبنم، شبنم شکیل، رشیدہ عیاں، پروین شاکر، شاہدہ حسن، حمیدہ شاہین، یاسمین حمید، شاہین مفتی، رفیعہ شبنم عابدی، صبیحہ صبا، شہناز مزمل، نسیم سید، تنویر انجم، عشرت آفریں، حمیرا آفریں، حمیرا رحمان، نوشی گیلانی، ثمینہ راجہ پنہاں، شہناز نور، تسنیم عابدی، نسیم نکہت، گلنار آفریں، وضاحت نسیم، نسیم نازش، ریحانہ روحی، محمودہ غازیہ، شاہدہ تبسم، رضیہ سبحان قریشی، صغرا صدف، رخشندہ نوید، ثروت زہرا، عنبرین حسیب عنبر، ذکیہ غزل، نرجس افروز زیدی، ریحانہ احسان، پروین حیدر، مہ جبیں نجم غزال، فوقیہ مشتاق، حمیرا راحت، خالدہ عظمیٰ، رخسانہ سحر، ثروت ظفر، سحر علی، صوفیہ بیدار، یاسمین حبیب، نوشابہ نرگس، نزہت عباسی، تزئین راز زیدی، عشرت معین سیما، مہ جبین غزل انصاری، فرزانہ نیناں، تنظیم الفردوس،

جہاں آرا تبسم، قندیل بدر، فاطمہ حسن کی غزلیات کے تجزیے شامل ہیں۔ فاطمہ حسن کہتی ہیں کہ غزل کی صنف میں جو زیادہ تر روایتی سمجھی جاتی ہے۔ غیر روایتی نسائی شعور سے لبریز موضوعات کس طرح اردو شاعرات کی زبان سے بیان ہوتے ہیں۔

اس باب کے انتخاب میں وہ شاعرات بھی شامل ہیں جنھوں نے صرف غزلیں لکھی ہیں اور وہ بھی جن کا ذکر نظموں کے ذیل میں بھی ہوا۔ فاطمہ حسن نے اشعار کی کی زیادہ وضاحت کرنے کے بجائے قارئین پر ہی چھوڑا ہے کہ وہ نسائی شعور کو ان اشعار میں دریافت کریں۔ زاہدہ خاتون شر انیہ کی سیاسی اور نسائی شعور سے لبریز نسائی شاعری سے لے کر آج کی نوجوان نسل کی شاعرات کے طرز اظہار تک اردو شاعری میں تانیثیت نے ایک طویل سفر کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب نسائی شعور سے براہ راست تو بحث نہیں کرتی لیکن تاریخی ارتقا کا سوال تانیثی ارتقا کی صورت میں سامنے ضرور آتا ہے۔ ان کی یہ کتاب نسائی شعور اور تانیثی مباحث کے ضمن میں کئی نئے سوالوں کو جنم دیتی ہے۔

مثلاً فاطمہ حسن کہتی ہیں کہ ہمارے سماج میں عمومی طور پر عورت کے مساوی حقوق سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر ہر سطح پر سماجی رویے اس کی مساوی حیثیت کو رد کرتے رہے ہیں جو بحیثیت باشعور انسان اسے حاصل ہونی چاہیے۔ اسی مقام سے نسائی ادب کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن اتنا شعور آنے کے باوجود کیا عورت نے اپنی منزل کو پالیا؟ کیا پدر سری معاشرہ خواتین کے حوالے سے جبری طور پر کمزور ہوا؟ کیا صنفی امتیازات میں کوئی کمی ہوئی؟ ان سوالوں کا جواب اس کتاب کے ذریعے دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ نسائی تخلیق کار بہت واضح طور پر کہتی ہیں کہ ہم وہ نہیں لکھ رہی ہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں کیونکہ جو وہ لکھتی ہیں مرد ویسا سمجھ ہی نہیں سکتے۔ آج کے بدلتے ہوئے عالمی نسائی تناظر میں عورت کی لکھی تخلیق کو اسی تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے جہاں عورت پورے شعور اور ادراک کے ساتھ موجود ہے۔ (۳۲)

فاطمہ حسن نے اس کتاب میں نسائی تنقید کے بارے میں اپنے خیالات کا مفصل اظہار کیا ہے۔ ایک طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی یہ تحریر عورت کی انفرادی کرداری حیثیت کو بیان کرتی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ نسائی تنقید نے مطالعے کا رخ تبدیل کیا ہے اور اسے نہ صرف نسائی کلچر کو فائدہ ہوا ہے بلکہ لکھنے والی خواتین میں اعتماد بھی پیدا ہوا ہے۔ جو نسائی شعور کو واضح کرنے میں معاون ہے۔ عصر حاضر میں تنقید مردانہ فلسفوں یا نظریاتی بنیادوں پر نہیں ہو رہی بلکہ

ادب کو اس نکتہ نظر سے دیکھا جا رہا ہے کہ اس میں مردانہ اور نسائی اقدار کا تناسب کیا ہے ؟یوں نسائی تنقید ادبی تجزیے کی بنیاد بن گئی ہے۔

سماجی اقدار جہاں دیگر معاشرتی رویوں پر اثر انداز ہو رہی ہیں وہیں خواتین کے اظہار خیال پر بھی ان کا اثر پڑا ہے۔ خواتین کے لیے ممنوعہ مضامین کی فہرست طویل تر ہے۔ ان کی ہر آزادی بہت سی پابندیوں کے تابع ہے۔ وہ کیا کر سکتی ہیں ؟ کیا نہیں ؟ کیا لکھ سکتی ہیں کیا نہیں ؟ اس بات کا تعین معاشرہ کرتا ہے۔ وہ معاشرہ جو پدر سری ہے ۔ خصوصاً ہمارے خطۂ زمین میں جہاں یہ سماج جاگیردارانہ بلکہ سرداری نظام ہے اس معاشرے میں آج بھی فرسودہ روایات موجود ہیں۔ اس سماج میں عورت کے فکر و شعور کی بات ممنوعہ ہے اور اسے کسی دوسری دنیا کی بات سمجھا جاتا ہے۔

نسائی تنقید یورپ میں پہلے شروع ہوئی ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ساری دنیا میں نسائی ادب کو اہمیت ملنا شروع ہوئی اسی کی وجہ سے نسائی تنقید کو اہمیت ملنا شروع ہوئی اردو ادب میں نسائیت کی تحریک کی جانب دیکھا جائے تو اس کی ابتدا مولانا حالی کی تحریروں سے ہوتی ہے جس میں کسی حد تک نسائی شعور موجود ہے۔ حالی ان اولین معماروں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے ادب اور معاشرے میں روشن خیالی کے چراغ جلائے انھی کی ہم عصر خواتین میں زاہدہ خاتون شیر انیہ پورے نسائی شعور کے ساتھ لکھ رہی تھیں لیکن چونکہ اس زمانے میں باقاعدہ تنقیدی نظام موجود نہیں تھا اس لیے ان کے اس شعور کو قبول عام کا درجہ نہیں ملا اور وہ گم نامی میں چلی گئیں۔ زاہدہ خاتون کی تحریروں پر سے پردہ اٹھانے اور ایسی جزئیات کو ان کے عہد کے رسائل نے محفوظ کر لیا جس کی وجہ سے ان کا ادب خاصا محفوظ ہوا۔ لیکن اس سلسلے میں ان کی شاعرہ بہن، احمدی بیگم نکہت کو بہت مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور انھوں نے اس سلسلے میں باقاعدہ خاموشی اختیار کر لی اور خود فراموشی کے عالم میں دنیا سے چلی گئیں۔ بعد میں بھی لکھنے والی خواتین معتوب قرار دی جاتی رہیں۔ جیسے نذر سجاد حیدر کے افسانوں پر عریاں نویسی کے الزام عائد ہوئے۔ ان کے بعد بہت سی نامور لکھنے والی خواتین سامنے آئی ہیں جن میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، خالدہ حسین، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور حالیہ دور تک لکھنے والی بے شمار خواتین مکمل شناخت کے ساتھ سامنے آئی ہیں لیکن عورتوں کے لکھے ہوئے ادب پر ناقدین کے رویے میں کوئی تبدیلی اس وقت تک نظر نہیں آتی جب تک نسائی تنقید نگاروں نے اس کی واضح نشان دہی نہیں کی۔

اسی لیے عصر حاضر کے ناقدین نے خواتین کی تحریروں میں شعور ذات اور اس کے حوالے سے شعور کائنات کے مطالعے کو اہم تصور کیا ہے۔(۳۳)

فاطمہ حسن نے اس کتاب میں نہ صرف نسائی شعور کی تمام اشکال کو بیان کیا ہے بلکہ انھوں نے خواتین کے انفرادی نسائی شعور کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔مثال کے طور پر ادا جعفری کے بارے میں کہتی ہیں کہ ان کی شاعری میں روایت کا شعور اور نئے طرز احساس کا ایسا امتزاج ہے کہ یہ تمام مروجہ اسلوب وروایت کے مطابق ہونے کے باوجود کچھ مختلف محسوس کی گئی جس میں ایک طرح کی تازگی ہے۔یہ تازگیان کے اپنے احساسات، کیفیات اور تجربات کی بنیاد پر ہے تاہم سادگی کے باوجود ادا جعفری کی شاعری میں ایسی تہ داری بھی ہے جو فکر کی گہرائی کے ساتھ سلیقہ اور صلاحیت اظہار سے نصیب ہوتی ہے وہ ایک با مطالعہ شاعرہ تھیں اور عصری شعور وادراک رکھتی تھیں ۔فاطمہ حسن کے الفاظ میں

ادا جعفری نے نظموں میں جدید اسلوب کو اپنایا مگر مضامین اور فکر

ایک عورت کی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔(۳۴)

اسی طرح فاطمہ حسن فہمیدہ ریاض کے تانیثی شعور کو واضح کرتی ہیں فاطمہ حسن کے یہ مختصر جملے دراصل نظم نگار خواتین کے انفرادی کردار کو پیش کرتے ہیں اور معاشرے کی تشکیل میں ان خواتین کے شعور کی تشکیلی جہات کو بھی واضح کرتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض کے بارے میں وہ کہتی ہیں کہ ان کی نظموں نے اردو شاعری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے جس میں عورت اپنی واضح شناخت، مکمل اعتماد اور ایسے موضوعات کے ساتھ داخل ہوئی جن پر قلم اٹھانا روایتی و سماجی اقدار کے تحت جنم لینے والے ادبی رویوں سے بغاوت تھی۔ فہمیدہ ریاض نے اپنی شاعری میں سر اٹھا کر جینے کا سلیقہ پوری جمالیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔یہ عورت روایتی معاشرے کے لیے ایک ایسی صنف تھی جس کی ذات کو صرف جمالیات کا مظہر سمجھا گیا چناں چہ اس کے شعور اور احساسات تک ان کی نگاہیں نہیں پہنچیں اس لیے ان کی شاعری میں الفاظ کے ایسے معنی اور گوشے تلاش کیے گئے جو اصل اظہار ہیں۔ جن سے ان کا نسائی شعور واضح ہوتا ہے۔ اسی طرح کشور ناہید کے بارے میں کہتی ہیں کہ کشور ناہید کی نظموں میں وہ اظہار ہے جو ان سے قبل قریباً مفقود تھا۔ وہ عورت ہونے کے ناتے نہ اپنے ہونے پر شرمندہ رہیں نہ اپنے جذبات کی پردہ پوشی کی۔ کشور ناہید

کائنات کو اپنی بصارت اور بصیرت سے دیکھتی رہیں اس کا اظہار بھی کرتی رہیں۔ انھوں نے براہ راست عورت کے جذبات اور مسائل کو موضوع بنایا اور پورے شعور و ادراک کے ساتھ ان سماجی رویوں پر احتجاج کیا جن کا شکار خواتین ہیں۔(۳۵)

پروین شاکر نسائی شاعری کے حوالے سے منفرد نام ہیں ان کا نسائی شعور واضح کرنے اور ان کی انفرادی پیش کش بھی فاطمہ حسن کے ہاں ملتی ہے وہ لکھتی ہیں کہ پروین شاکر کا تعلق اس نسل سے ہے جنھوں نے عصر حاضر کے تخلیقی رجحان اور نظم گوئی کو اہمیت دی، ہیئت اور اسلوب کے تجربے بھی کیے اور عالمی ادب کے دھارے سے منسلک بھی رہیں۔ پروین شاکر کی شاعری میں نوجوان لڑکی کے جذبات کا وہ بے ساختہ اظہار ہے جو روایتی معاشرے میں پروان چڑھی ہے جس نے بغاوت تو نہیں کی مگر وہ سب کہہ لکھ دیا جو اس کا تجربہ تھا۔

پروین شاکر ایک ایسے عہد کی نمائندہ ہیں جو مکمل روایتی بھی نہیں رہا مگر روایتی اقدار کو تحفظ دینے کے لیے ہر قربانی کا عورت سے طلب گار ہے۔ ان کی شاعری میں وہ تجربات پیش ہوئے ہیں جو انھوں نے خود پر بتائے اور محسوس کیے جن میں صرف رومان ہی نہیں بلکہ عصری آگہی اور ملازمت پیشہ خواتین کے تجربات بھی موجود ہیں۔ عورت خواہ محبوبہ ہو، بیوی ہو یا اعلیٰ عہدے پر متمکن کوئی عورت، وہ کن فکروں اور اندیشوں سے گزرتی ہے۔ پروین شاکر نے ان لہروں کو محسوس کیا جو مغرب سے ہمارے ادب میں آئی ہیں۔ اس میں نسائی شعور کی لہر سب سے زیادہ طاقتور تھی ان کی شاعری میں ان لطیف جذبات اور مخصوص کیفیات کا اظہار ہے جو عورت کی شخصیت سے عبارت ہے۔

تعلیم ایک عرصے تک برصغیر کی مسلمان لڑکیوں کے لیے ممنوعہ رہی لیکن جب عورت نے اظہار کرنا شروع کیا تو صنفی امتیاز کے خلاف بھرپور مزاحمت کی۔ ان کی نظموں میں احتجاج اور مزاحمت کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ نسیم سید کی شاعری میں شدت اظہار خصوصاً صنفی امتیاز کے رویوں پر ان کا نقطۂ نظر پوری طرح موجود ہے۔ فاطمہ حسن کہتی ہیں۔

> نسائی شعور کا سفر ہو یا شعور انسانی کا، خواتین ہر مرحلے، ہر مقام
> پر اپنی فکر و دانش اور احساس جمال کے ساتھ موجود ہونے کا ثبوت
> دیتی رہی ہیں۔ یہ بتاتی رہی ہیں کہ ان کا وجود کسی بھی ایسے فرد کی

طرح ہے جو انسان ہے، مفروضوں کی بنیاد پر ڈھلا ڈھلایا کردار

نہیں اس کی شناخت مسلط کردہ کردار سے نہیں اس کے حقیقی

جوہر سے ہونی چاہیے۔(۳۶)

ہمارے معاشرے میں عورت کے لیے پناہ گاہیں بنانے پر زور دیا گیا ہے، خود اسے مضبوط بنانے پر توجہ نہیں دی گئی۔ یہ پناہ گاہیں اس کے باپ کا گھر، شوہر کا گھر اور بیٹے کا گھر ہے اس کا اپنا گھر کہیں بھی نہیں جہاں وہ اپنی مرضی اور اپنی انا کے ساتھ رہ سکے۔ اپنی مرضی کی نیند سو سکے۔ لباس پہن سکے اور کھانا کھا سکے۔ صدیوں سے بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھنے اور پردے اور دیواروں میں قید کرنے کو اس کے تحفظ کا نام دینے کے لیے کتابوں کے اوراق سیاہ کیے گئے ہیں ان کے اثرات ادب پر بھی واضح ہیں خواہ شعوری ہوں یا لاشعوری۔ ادیبوں نے عورت کو کہیں فرشتہ لکھا ہے تو کہیں شیطان، انھیں ان کے جسم کے علاوہ ذہن نظر نہیں آتا۔

عصر حاضر میں صنفی امتیاز کی صورت حال واضح ہونے کے باوجود سماج میں منافقانہ رویہ موجود ہے۔ یہ رویہ عورت اور مرد، دونوں کے لیے نفسیاتی مسائل پیدا کر رہا ہے، کیوں کہ صنف صرف عورت یا مرد نہیں بلکہ وہ فرد ہے جس کے لیے کچھ ذمے داریاں اور رسوم و رواج متعین کر دیے گئے ہیں لیکن مرد آزاد ہے اور عورت پابہ زنجیر ہے۔ فاطمہ حسن کی تحریریں نسائی شعور کو اجاگر کرنے میں معاون ہیں اور عصر حاضر کے تناظر میں ان کی تحریریں تانیثیت کا عمدہ نمونہ ہیں۔

حوالہ جات

۱۔فاطمہ حسن،کہانیاں گم ہو جاتی ہیں،کراچی:شہرزاد پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء،ص۳۱۔

۲۔ایضاً،ص۳۰۔

۳۔ایضاً،ص۱۰۸۔

۴۔ایضاً،ص۱۶۰۔

۵۔ایضاً،ص۴۵۔

۶۔فاطمہ حسن،خاموشی کی آواز،کراچی:انجمن ترقی اردو،پاکستان،۲۰۱۸ء،ص۱۰۔

۷۔ایضاً،ص۱۱۔

۸۔ایضاً،ص۱۷۔

۹۔ایضاً،ص۲۲۔

۱۰۔ایضاً،ص۲۷۔

۱۱۔ایضاً،ص۳۱۔

۱۲۔ایضاً،ص۶۱۔

۱۳۔ایضاً،ص۶۶۔

۱۴۔ایضاً،ص۷۳۔

۱۵۔ایضاً۔

۱۶۔فاطمہ حسن،میلے میں گم،مشمولہ ماہنامہ قومی زبان دسمبر ۲۰۱۴،ص۷۵۔

۱۷۔فاطمہ حسن،اداریہ،ماہنامہ قومی زبان،مارچ ۲۰۱۹،ص۴۔

۱۸۔ ایضاً۔

۱۹۔ فاطمہ حسن، شاہ محمد مری، بلوچستان کا ادب اور خواتین، کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۶ء، ص ۳۴۔

۲۰۔ فاطمہ حسن، فیمنزم اور ہم، کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۱۵ء، ص ۶۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۱۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۸۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۲۵۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۳۲۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۴۸۔

۲۶۔ فاطمہ حسن، کتاب دوستاں، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۳۴۔

۲۷۔ فاطمہ حسن، زاہدہ خاتون شروانیہ (زخ ش)، کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۱۴ء، ص ۴۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۹۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۱۵۔

۳۰۔ فاطمہ حسن، اردو شاعرات اور نسائی شعور سو برس کا سفر (۱۹۲۰-۲۰۲۲)، نیویارک: ورثہ پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء، ص ۸۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۹۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۹۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۷۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۴۳۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۴۱۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۵۶۔

باب چہارم:

فاطمہ حسن کی نثری تحریروں میں معاصر صورت حال کی عکاسی

باب چہارم

فاطمہ حسن کی نثری تحریروں میں معاصر صورت حال کی عکاسی

فاطمہ حسن نے اپنی تحریروں میں پاکستانی سماج کے ساتھ ساتھ بین الا قوامی معاصر صورت حال کا تجزیہ بھی بہت عمدہ کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنی شاعری بلکہ اپنی نثر میں بھی بنیادی انسانی حقوق اور معاشرے میں انسانی حقوق کے لیے عملی جدوجہد کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ایک طرف پدری سماج سے بیزاری، خواتین کی سماجی حیثیت کی بحالی، تہذیبی اقدار وروایات کی پاسداری، ملک کے سماجی، سیاسی واقتصادی مسائل کا ادراک نظر آتا ہے تو دوسری طرف کہیں کہیں ان کی تحریروں میں ان مسائل کا حل بھی نظر آتا ہے۔

فاطمہ حسن کے عصری شعور میں سب سے زیادہ دخل پاکستانی عورت کی معاصر صورت حال کو ہے جن کے بارے میں فاطمہ حسن کی بہت تحریریں ملتی ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ پاکستانی خواتین چونکہ بے شمار خاندانی مسائل اور گھریلو تشدد سے متاثر ہیں اسی لیے ان کے لیے ایک باشعور فرد کی حیثیت سے اپنے شرعی وآئینی حقوق سے واقفیت حاصل کرنا لازم ہو گیا ہے۔ جس کے استعمال سے وہ اپنی ذاتی وسماجی زندگی باوقار انداز سے گذار سکتی ہیں۔ اس بات کی بھی سخت ضرورت ہے کہ خواتین کی تعلیم، ترقی اور سماجی بہتر صورت حال کے لیے دستیاب سرکاری سہولتوں اور روسائل تک ان خواتین کی پہنچ ہو اور وہ ان سے استفادہ کر پائیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے فاطمہ حسن نے بہت سی نثری تحریریں لکھیں۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے حکومت اور سماجی تنظیموں کو ذمہ دار ٹھہرانے کے بجائے مسلم معاشرے کے زیادہ سے زیادہ مرد وخواتین کو اب میدانِ عمل میں آنا چاہیے اور اپنی خواتین کی حالت خود بہتر بنانی چاہیے تاکہ خواتین کی تعلیمی، سماجی، معاشی پست حالت کو بہتر بنایا جاسکے اور عصر حاضر میں پاکستانی سماج میں ان کے متعین حقوق

انھیں دیے جا سکیں۔ عورتوں کو اس قابل بنایا جاسکے کہ وہ اپنے شرعی، آئینی و قانونی حقوق کا استعمال کرتے ہوئے، تعلیم یافتہ، ہنر مند، باصلاحیت، باشعور اور با اختیار سماجی فرد کی حیثیت سے پاکستان میں باوقار زندگی گزار سکیں نیز بدلتے تقاضوں کا ساتھ نباہتے ہوئے یہ عورتیں معاشرتی ارتقا میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

فاطمہ حسن کے یہاں سماجی صورت حال کی سب سے زیادہ عکاسی ان کے اداریوں میں ہوتی ہے۔ ماہنامہ قومی زبان میں لکھے گئے ان کے اداریے معاصر صورت حال کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان کے اداریوں میں عصر حاضر کے مسائل کی نشان دہی بھی ملتی ہے اور ان کے عہد کے ادب کے مزاج کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ ان میں عصر حاضر کے ادبی و فکری اور معاشی و معاشرتی مسائل کا پورا پورا شعور بھی ملتا ہے۔ فاطمہ حسن نے ملکی و قومی سطح پر جن فکری مسائل کی نشاندہی کی ان میں سب سے بڑا مسئلہ موجودہ دور میں عورت کی حیثیت کا روبہ تنزل ہونا ہے۔ انھوں نے غیر جانب داری سے معاشرے میں عورت کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ اور ان تمام عناصر اور عوامل کو موضوع بحث بنایا جنھوں نے ملکی سطح پر عورت کے کردار کو متاثر کیا۔ اسی حوالے سے ان کا عصری شعور سب سے زیادہ نسائی تحریک سے جڑا نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک نسائی ادب کی تحریک دراصل اس نسائی بیداری کی تحریک سے جڑی ہے جو عورت کی بنی نوع انسان کی حیثیت سے بنیادی حقوق کی بات کرتی ہے۔ اور اس سماجی رویے کی مذمت کرتی ہے جس میں عورت کو شے سمجھا جاتا ہے اور اس کی تذلیل کی جاتی ہے کتنی عجیب بات ہے کہ آج جب ہمارے یہاں نعرہ لگایا جا رہا ہے کہ خواتین کے حقوق، انسانی حقوق ہیں ایسے میں وہ دانشور خواتین، جو اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں اور وسیع مطالعے کی وجہ سے اپنی فکر میں ایسے مقام پر کھڑی ہیں جو اشرف المخلوقات کا منصب ہے انھیں ناقص العقل اور مرد کو راحت پہنچانے کی شے سمجھے جانے پر اصرار کیا جارہا ہے۔

فاطمہ حسن کا یہ عصری شعور براہ راست نسائی شعور سے منسلک ہے۔ اس انسلاک کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تحریریں براہ راست عصری صورت حال کی ترجمان بن گئی ہیں وہ کہتی ہیں کہ نسائی شعور کی تاریخ جاننے کے لیے مورخ خواتین کو ڈھونڈا جائے تو بہتر نسائی شعور کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔

ہر ادیب اپنی معاشرتی صورت حال سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ضرور ہوتا ہے۔ فاطمہ حسن بھی اپنے عہد سے

متاثر ہیں۔ انھوں نے عصر حاضر کی اہم اصطلاحات پر اپنے خیالات کا اظہار اپنی رپور تاژ "میلے میں گم" میں کیا ہے۔ انھوں نے عالم گیریت پر لکھا ہے۔ اصطلاحی معنوں میں دیکھا جائے تو عالم گیریت سے مراد عصر حاضر کا ایسا جدید سماجی و معاشی نظام کا قیام ہے جس کے تحت دنیا کے تمام لوگوں کے لیے برابر زندگی کا حصول ممکن ہو سکے۔ دنیا کے تمام لوگ ایک ہی سیاسی، سماجی اور معاشی اور ثقافتی سماج کے تحت متحد ہو جائیں اور ایک ایسا انسانی خاندانی نظام جنم لے سکے جس میں سب برابر انداز سے زندگی گزار سکیں۔(۱)

عالم گیریت در اصل ایسا نظریہ اور تصور تھا کہ حقیقی معنوں میں ہر نوعیت کی عصبیت کا خاتمہ کر کے دنیا بھر کے انسانوں کو یکساں کیا جا سکے۔ انفرادی ملکیت کا تصور ختم کیا جائے۔ اجتماعی سطح پر ذرائع پیداوار، دولت، سرمایہ غرض تمام وسائل پوری دنیا کے لوگوں کے لیے ایک جیسے دستیاب ہوں۔ عالمگیریت ایسا تصور ہے جو جغرافیائی حدبندیوں سے آزاد ہے۔ فاطمہ حسن بھی لکھتی ہیں کہ عالم گیریت کارپوریٹ اکنامی کو تحفظ دینے والی اصطلاح ساری دنیا کو مارکیٹ میں تبدیل کر گئی ہے جہاں کے انسان مشین میں ڈھل گئے ہیں اور مالکوں کے لیے پیسے ڈھال رہے ہیں آفاقیت اقوام عالم کو ایک ایسی برادری بنانے کی خواہش ہے جہاں انسانی محسوسات، محبتیں اور جذبات سلامت رہیں ادب اور آرٹ اسی لیے تو ہے اگر ہاتھ سے اسلحہ لے کر قلم تھما دیا جائے تو آفاقی برادری کا تصور حقیقت بن جائے گا۔

فاطمہ حسن کے تحریر کردہ اداریے ان کی سماجی و معاصر شعور کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔ فاطمہ حسن نے قوم کے نوجوانوں کو عصری صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے اپنے اداریے میں لکھا ہے کہ نوجوان نسل کو الفاظ کو ذریعۂ اظہار بنانا چاہیے۔ الفاظ خود علامت ہیں مگر ان سے مطالب ادا کرنے کے لیے ٹھوس علامتوں اور استعاروں کا استعمال بھی ضروری ہوتا ہے۔ یہ علامتیں اور استعارے مفاہیم تک رسائی کے لیے تصورات کو واضح کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کی عبارتوں کو اقوال کی شکل میں یاد کرتے ہوئے ان علامتوں کو نشان راہ سمجھ لینا اور بنیادی فکر کو نظر انداز کر دینا اصل راہ سے بھٹک جانا ہے۔ یہ راہ سہل پسندی کی ہے جو شخصیت پرستی کی طرف لے جاتی ہے۔ فاطمہ حسن شخصیت پرستی سے دور رہنے کی تلقین کرتی ہیں کہ فکر سے گریز کی عادت ایسی بے بصیرت تقلید ہے جس کا حاصل کچھ بھی نہیں۔

فاطمہ حسن عصری صورت حال کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے نوجوانوں کو درس دیتی ہیں کہ وہ قائد اعظم

کے اقوال وافعال سے مستفید ہوں۔ ان کے نزدیک قائد اعظم کے اقوال سے ایمان، اتحاد اور تنظیم کو علامتوں میں ڈھال کر مجسم کر دینا ہی کافی نہیں اس فکر کو ذہنوں میں بسانا ضروری ہے جس کی تفصیل ان علامات میں چھپی ہے جن کی یاد دہانی کے لیے یہ علامات مجسم کی گئی ہیں۔ یہ محض قائد اعظم محمد علی جناح کے نام اور ان کے چند الفاظ کی تکرار کے لیے نہیں، یہ علامات تو اس منزل تک پہنچنے کے لیے سنگ میل کے ہندسوں کی طرح ہیں جو ترقی کی راہ پر نصب ہیں یہ ہندسے فاصلے بتاتے ہیں سمت نہیں۔ سمت کے لیے غور کرنا پڑتا ہے آنکھیں اور ذہن کھلا رکھنا پڑتا ہے تب یہ فاصلہ عبور ہوتا ہے ورنہ نہیں۔ یہ سنگ میل جو قائد اعظم کا دکھایا ہوا ہے تین بنیادوں پر استوار ہے۔ ایمان اس نظریے پر جو پاکستان کے قیام کی بنیاد ہے اتحاد اس بنیاد کو مضبوط رکھنے کے لیے اور تنظیم بحیثیت قوم اعلیٰ ترین مقام تک رسائی کے لیے۔ یہ مقام اقتصادیات، سماجیات، سیاسیات، علوم وایجادات، غرض ہر شعبے میں ایک نمایاں مقتدر قوم کی حیثیت سے شناخت کا ہے۔(۲)

فاطمہ حسن کہتی ہیں کہ ماضی سے مستقبل تک کے سفر میں رہ نمائی کے لیے قائد اعظم کی وسیع تر فکر ان کے الفاظ میں معنی و مفاہیم کی گہرائی اور دانش کی وسعتوں کے ساتھ موجود ہے۔ انھیں پڑھنے اور یاد رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے مفاہیم پر غور اور وقت و حالات کی مناسبت سے عمل میں تقلید آج بھی اتنے ہی استفادے کا باعث ہو سکتی ہے جتنی ماضی میں تھی۔ اس دانش تک رسائی غور و فکر ہی سے ممکن ہے جس کے لیے علم کی روشنی اور عمل کی نیت ضروری ہے خصوصاً آنے والے وقت میں نئی نسل کو اس راہ پر گامزن رکھنے کے لیے، جو ہمیشہ قائد اعظم کے پیش نظر رہی۔ انھوں نے علم کی اہمیت اور طالب علموں سے قربت کو ترجیح دی۔ طلبہ سے مخاطبت کے ہر موقع پر اپنے خیالات کو بے لاگ طور پر پیش کیا۔ عصری صورت حال میں قائد کے اقوال پر عمل پیرا ہو کر قوم کی حالت سنواری جا سکتی ہے۔

موجودہ صورت حال میں پاکستانی معاشرہ جس تفرقہ بازی میں پڑا ہوا ہے فاطمہ حسن اس صورت حال میں قائد کی زندگی کی طرف مراجعت کا درس دیتی ہیں۔ برصغیر کے مسلمان ایک قوم ہیں یہ ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے قوم کو بھی بتایا کہ اخوت، مساوات اور حریت ہمارے مذہب، تہذیب اور تمدن کے بنیادی نقطے ہیں۔ فاطمہ حسن کے بقول قائد کے یہ اقوال ہمارے لیے ایک روشنی ہیں جس میں ہم اپنی منزل کا تعین کر سکتے ہیں جس کی راہ پر

ایمان، اتحاد اور تنظیم سنگ میل کی طرح نصب ہیں۔ فاطمہ حسن پاکستانی سیاست دانوں کو سوچنے کا درس دیتی ہیں کہ دسمبر کے مہینے میں یوم قائد کے حوالے سے اہل اقتدار و صاحبان استطاعت کے پیش نظر سب سے اہم سوال یہی ہونا چاہیے کہ عوام اور غریب طبقے کی فلاح کے حصول کے لیے کیا کیا گیا؟ اور کیا نہیں کیا گیا؟

فاطمہ حسن عصری صورت حال پر سوال اٹھاتی ہیں کہ عوام کی فلاح کے لیے سیاست دانوں کے اہداف کیا ہیں ؟ اس ہدف کے حصول تک رسائی، کیا ان کی ترجیحات میں موجود ہے اور اس پر کتنی پیش رفت ہوئی ہے ؟ انھوں نے جون ۲۰۱۹ء میں لکھے ہوئے اپنے ایک اداریے میں حکمران اور عوام کی دوریوں کا تذکرہ کیا ہے ان کے نزدیک حکمران عوام سے دور ہیں عوام سے ان کی دوری میں اس احساس برتری کا بڑا دخل ہے جو انھوں نے انگریز افسران کے جانے کے بعد ان کی زبان کا سہارا لے کر ان کے ہی رویے کی نقل کرتے ہوئے اپنایا ہے انگریزی لبادے میں ملبوس حاکم بنے یہ افسران بلکہ ان کے ماتحت ملازمین تک اپنے اصل فرائض سے غافل ہی نہیں ان لوگوں سے حقارت آمیز انداز میں بات بھی کرتے ہیں جو انگریزی میں گفتگو نہیں کر سکتے خواہ وہ کتنے ہی علم و دانش کے حامل ہوں اس طرح ایک اقلیت صرف انگریزی زبان کی بنیاد پر عوام کی اکثریت پر حکومت کرتی رہی ہے یہ وہ اقلیت ہے جس کی ذہنی صلاحیت پر گزرتے ہوئے وقت نے بہت سے سوالیہ نشان چھوڑے ہیں۔(۳)

فاطمہ حسن موجودہ معاشرتی صورت حال پر سوال اٹھاتے ہوئے کہتی ہیں کہ صرف انگریزی زبان میں ہونے والے مقابلے کے امتحانات اور انٹرویوز سے گزر کر ملکی اور بین الاقوامی عہدوں پر تعینات رہنے والے اس طبقے نے اکہتر برس میں کیا کارنامے سرانجام دیے ہیں؟ کیا کوئی تعلیمی پالیسی دی؟ عوام کی رہائش اور صحت کے مسائل حل کیے؟ ملکی، معاشی اور اقتصادی صورت حال کو بد سے بدتر ہونے سے بچایا؟ انگریزی زبان پر اپنی قدرت کو بین الاقوامی تعلقات اور سفارتی مراسم میں استعمال کیا؟ یہاں تک کہ کیا اپنی قومی شناخت کو اجاگر کرنے کی بے حد بنیادی ذمہ داری کی طرف توجہ دی؟ قومی شناخت کا حصول فاطمہ حسن کے نزدیک سب سے اہم ہے تب ہی ہم ترقی کر سکتے ہیں ورنہ نہیں۔

فاطمہ حسن نے اسی اداریے میں موجودہ صورت حال کا ایک عمدہ جائزہ پیش کیا انھوں نے پاکستان اور دوسری اقوام کا عصری صورت حال میں جائزہ لیا انھوں نے پاکستانی سیاست کی کمزوریوں کو بیان کیا اور بتایا کہ ہماری نسبت ان

قوموں نے جو اپنی زبان کو ترجیح دیتی ہیں تیزی سے ترقی کی ہے ہماری افسر شاہی نے صحت، تعلیم، انصاف اور امن و امان کے اداروں کو کم زور کیا اور عوام تک ان کی رسائی کے دروازے بند کیے سول سرونٹس خادم کی بجائے حاکم بنے رہے اور ان کی کوشش رہی کہ عام لوگ ان کی سطح پر نہ آسکیں اس لیے سرکاری اسکول، اور دیگر تعلیم گاہیں جہاں سے ماضی میں نابغۂ روزگار ہستیاں نکلیں، ان کے نظام کو کمزور کر کے تعلیم کو بھی تجارت بنادیا ایسی تجارت جس میں منافع ہی منافع ہو۔ تعلیم کے شعبے کو طبقات میں تقسیم کرنے والے دانش و بصیرت کی کس سطح پر تھے اس کا اندازہ موجودہ شرح خواندگی سے لگایا جاسکتا ہے۔ جہاں علم کا معیار انگریزی پر دسترس اور غیر زبان میں ڈگری حاصل کرنا مقصد ہو وہاں دانش کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟(۴) فاطمہ حسن کا اسلوب اس اداریے میں ایسا تند ہے کہ وہ قاری کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں کہ غیر زبان میں ڈگری حاصل کرنے کے لیے اس زبان و ثقافت کو تج دینا جو ہمارے خطے کے عوام کی پروردہ ہے کہاں کی دانش مندی ہے دانش و بصیرت جس مطالعے اور مشاہدے سے ممکن ہے وہ برآمد اور ملاوٹ شدہ تعلیم سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کا حصول اس اجتماعی دانش کا حصہ بن کر ممکن ہے جو صدیوں میں ایک خطے میں پروان چڑھتی ہے۔ اور یہ دانش اپنی زبان و ثقافت سے وابستگی چاہتی ہے۔ دراصل فاطمہ حسن عصر حاضر میں پاکستانی صورت حال کے عموی مزاج سے قاری کو واقف کر رہی ہیں۔

پاکستان کو جو چند بڑے مسائل در پیش ہیں ان میں بدعنوانی سب سے پہلے نمبر پر ہے۔ چند ادارے بدعنوانی کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں، اگر ان کو صحیح کر دیا جائے تو ملکی حالات بالکل بدل سکتے ہیں جیسے، پولیس اور دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کا نظام شفاف بنانے کی اشد ضرورت ہے، اس کے ساتھ ساتھ قانونکے ادروں اور عدالت کے نظام کو بہتر بنانے کی زبردست گنجائش موجود ہے۔ اس کے علاوہ بجلی و پیٹرولیم کی فراہمی کے ادارے، ٹیکس جمع کرنے والے ادارے، کسٹمز، تعلیم و صحت سے متعلق ادارے، زمین و جائیداد کا انتظام و انصرام کرنے والے ادارے، ان سب اداروں میں نہایت ہی اعلیٰ درجے کی اخلاقی و پیشہ ورانہ تربیت کے ساتھ ساتھ بدعنوانی کرنے والے افراد کو قرار واقعی سزائیں بھی دی جانے کی شدید ضرورت ہے جو یقیناً ملک میں بدعنوانی کو کم کرنے اور حالات کو ملک کے موافقت میں لانے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس ضمن میں پارلیمنٹ قانون سازی کے ذریعے اہم ترین کردار ادا کر سکتی ہے، جو اداروں کو قانونی اور آئینی طاقت فراہم کرنے کا سبب ہو سکتی ہے جن کے زیادہ سے

زیادہ استعمال سے حکومتی سطح پر شفاف احتساب کے ذریعے بہترین نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ فاطمہ حسن لکھتی ہیں۔

یہاں خود مختاری صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو صاحب رسوخ ہیں۔

عام لوگوں کے لیے سب قاعدے قوانین سرکاری ہیں۔ (۵)

فاطمہ حسن کے نزدیک عصری صورت حال میں قومی زبان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ان کے نزدیک زبان ہی وہ بنیادی اکائی ہے جس پر قوم کی شناخت کا دارومدار ہے۔ انھوں نے اپنے تقریباً اسی فیصد اداریوں میں قومی زبان اردو کی اہمیت کے متعلق ہی بات کی ہے ان کے نزدیک قومی زبان کو تعلیم کی زبان ہونا چاہیے۔ جنوری ۲۰۱۹ء کے اداریے میں زبان کے متعلق ان کے تفصیلی خیالات ملتے ہیں (۶) کہ اسی کی دہائی میں قیام پاکستان کے ستر سال بعد قومی زبان اردو کو سرکاری اور دفتری زبان بنانے کے قانون پر عمل کا فیصلہ ملک کی سب سے بڑی عدالت نے ۲۰۱۵ء میں سنایا۔ ۲۰۱۸ء تک اس پر کتنا عمل درآمد ہوا۔ اردو میں چند تقاریر کی سرشاری اور انگریزی میں بہت سے خطابات کی ندامت ہی نظر آتی ہے۔ لیکن بہر حال یہ خوش آئند بات ہے کہ اب اردو کو کوئی اہمیت مل رہی ہے اور اس حوالے سے تعلیمی اداروں میں بھی اس زبان پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ اس حوالے سے فاطمہ حسن کے کئی اداریے ملتے ہیں۔

ماہ ستمبر ۲۰۱۷ء کے اداریے میں بھی قومی زبان اردو کے متعلق لکھتی ہیں کہ قومی زبان سے محبت کا اعادہ اچھا عمل ہے اگر یہ اس زبان پر فخر اور اس کے فروغ کی خوشی میں کیا جائے مگر یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ایسا نہیں ہے جہاں پاکستان کی ایک بڑی آبادی انگریزوں اور انگریزی سے آزاد ہونے پر خوش ہوئی اور اس جبر سے چھٹکارا چاہتی ہے جو انگریزی زبان کے بل پر ان پر مسلط کیا گیا۔ وہاں ایک مفاد پرست طبقہ اپنے استحصالی رویوں کے ساتھ زبان کو ڈھال بنا کر اقتدار پر قابض ہے انھیں نہ آئین کی شق کا پاس ہے نہ عدالتی فیصلے کا احترام۔ (۷) اس مسئلے کی جانب فاطمہ حسن وقتاً فوقتاً توجہ دلاتی رہتی ہیں۔

عصر حاضر میں کتاب کلچر ختم ہوتا جارہا ہے مطالعہ کتاب کو صاحب کتاب سے آدھی ملاقات بھی کہا جاتا ہے۔ گویا کسی بھی شخص کی لکھی ہوئی کتاب پڑھنے کا مطلب ہے کہ ہم نے اس سے بالمشافہ ملاقات کرلی جو کہ حقیقی زندگی

میں ناممکن ہے۔اس کے تجربات اور خیالات کو جان کر ہم اپنی زندگی کو پہلے سے بہت بہتر بنا سکتے ہیں۔جو نقصانات انھوں نے اٹھائے ہیں ہم ان سے بچ سکتے ہیں۔ان کے تجربات سے سیکھ سکتے ہیں۔ان کے افکار سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ان کی مدد سے اپنے خیالات کا رخ تبدیل کر سکتے ہیں۔

عصر حاضر میں کتاب پڑھنا دور کی بات لوگ کتاب کو دیکھنا بھی نہیں چاہتے اس ساری صورتحال کی عکاسی فاطمہ حسن کی تحریروں میں جابجا ملتی ہے وہ اپنے جولائی ۲۰۱۹ کے اداریے میں لکھتی ہیں مطالعے کی عادت اور کتب بینی کے فروغ پر جتنی توجہ کی ضرورت اب ہے پہلے تو کبھی نہیں تھی ایک وقت تھا کہ ہر گھر میں ذاتی لائبریری نہ بھی ہو تو کم از کم ایک دو ایسے شیلف ہوتے تھے جن پر بچوں اور بڑوں کی کتابیں سجی ہوتی تھیں بچوں اور خواتین کے رسائل کے علاوہ ادبی جریدے بھی باقاعدگی سے آتے تھے ان کے آپس میں تبادلے بھی ہوتے تھے ہر محلے میں دیگر اشیائے ضرورت ساتھ آنے دو آنے میں کتابیں کرایے پر دینے والی چھوٹی لائبریریاں بھی ہوتی تھی جہاں "داستان امیر حمزہ" سے "آگ کا دریا" تک کہانیاں افسانے اور ناول کرائے پر دستیاب ہوتے تھے بچوں میں کتابیں پڑھنے کا شوق بچپن میں پیدا کر دیا جاتا تھا۔پھر یوں مطالعہ ان کی عادت بن جاتی ہے ایک اور دو آنے میں کتاب ایک روز میں ختم کرنے کی جلدی پڑھنے کی رفتار کو تیز کیا ہے۔مطالعے کی عادت انہیں لوگوں میں ہوتی ہے جن کے پڑھنے کی رفتار تیز ہو آہستہ پڑھنے والے مطالعے سے کتراتے ہیں تیز رفتار والوں کو فلم اور ڈراموں کی بہ نسبت افسانوں اور ناولوں میں زیادہ دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔ایک مرتبہ مطالعے کی عادت ہو جائے تو زندگی بھر قائم رہتی ہے بلکہ بڑھتی عمر کے ساتھ پختہ ہوتی چلی جاتی ہے۔یہ عادت زندگی کو آسان بھی کر دیتی ہے بہت سے ذہنی امراض سے بچاتی ہے بچپن میں مطالعے کی عادت نہ ڈالنے والے والدین اپنے بچوں کو بہت بڑی نعمت سے محروم کر دیتے ہیں کتابیں ان کی کی دوست اور ایسی رفیق ہوتی ہیں جو انسانی ذات اور کائنات سے متعلق بہت سے راز کو آشکار کرتی ہیں ترقی یافتہ ممالک میں کتب بینی کے فروغ اور کتابوں کے مہیا کیے جانے پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے بہت مصروف تیز رفتار اور سائنسی ایجادات کی زد میں آئے ہوئے مغربی ممالک میں ہر عمر کے افراد کے ہاتھوں میں کتاب اور محلے میں لائبریری کی موجودگی کو دیکھا جا سکتا ہے کتابوں کی دکان بھی ہر جگہ موجود ہے اور ان پر خرید و فروخت ہے۔لیکن پاکستان میں ایسا نہیں ہوتا فاطمہ حسن اسی جانب توجہ مبذول کرا رہی ہیں۔(۸)

فاطمہ حسن نے شاہ محمد مری کی کتاب "بلوچ سماج میں عورت کا مقام:ایک مطالعہ" پر تفصیلی بات کی ہے کہ یہ کتاب

بلوچ علاقے کی خواتین کی طرز زندگی، ان کے مسائل اور ان پر ہونے والے ظلم و جبر کی تحقیقی دستاویز ہے۔ یہ کتاب عورتوں کی حالت زار بدلنے کی خواہش ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب خواتین کو خود اس بات کا ادراک ہو کہ انھوں نے اپنی حالت بدلنی ہے اسے بدلنے کے لیے ان میں شعوری تحریک بیدار کرنا ضروری ہے۔ شاہ مری کی یہ خواہش مارکس ازم کا حصہ ہے جس میں جبر کی قوت کے خلاف بغاوت کرنا اور معاشرے کو ہر استحصال سے پاک کرنا، ہر اس فرد اور طبقے کا فرض ہے جو اس سے دوچار ہے۔ چونکہ مصنف کا تعلق خود بلوچستان سے ہے اس لیے وہ اس نظام کی سفاکیوں سے آگاہ ہیں۔ اس لیے وہ اپنی قلم کی نوک سے اس سماج کے بخیے ادھیڑتے ہیں۔ وہ ایسے سماج کو بے نقاب کر رہے ہیں۔ جہاں جہالت نے ایک پورا انسانی گروہ تاریکی میں دھکیل رکھا ہے۔ ایسے سماج پر لکھنا بہت مشکل ہے جو پسماندہ بھی ہو اور جبر میں مبتلا بھی ہو جہاں انسانی مقام کے بارے میں بھی سوچنے کا ماحول نہیں ہے وہاں عورت کے بارے میں لکھنا بہت بڑا کام ہے۔ یہ عصری شعور رکھنے والے ادیب کا ہی دل گردہ ہے کہ وہ ایسے موضوعات پر لکھے (۹)۔

عصر حاضر کا ایک اہم سماجی مسئلہ تعلیم اور بالخصوص مسلمان لڑکیوں کی تعلیم ہے جس کے بارے میں فاطمہ حسن نے کھل کر بات لکھی ہے۔ انھوں نے بلوچستان میں عورت کے مسئلے پر شاہ محمد مری کے خیالات سے مکمل اتفاق کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ نصاب اور تعلیم کے باب میں انھوں نے جو مشورہ دیا ہے وہ پورے ملک کی لڑکیوں کی تربیت کے لیے اہم ہے۔ تعلیم کا پورا باب ہمارے ملک کے مقتدر حلقے کو فکر کی دعوت دیتا ہے تعلیم ہی خواتین کے مسائل کا واحد حل ہے کیونکہ جب تک ان میں وہ شعور پیدا نہ ہو جو علم عطا کرتا ہے ان کے لیے سماج میں کوئی حیثیت حاصل کرنا ممکن نہیں۔ کاغذ پر لکھے ہوئے حقوق ان کے لیے بے معنی ہیں جن کا انھیں علم ہی نہیں۔ یہ حقوق تو ان کے شعور کے ذہن میں نقش ہونے چاہیے تاکہ وہ جہاں عورت کی حق تلفی دیکھیں اس پر احتجاج کریں۔ رویے صرف قانون سے نہیں بدلے جاسکتے۔ اس کے لیے پورے ماحول، سماج اور افراد کو تبدیلی کے لیے باقاعدہ تیار کرنا پڑتا ہے۔

فاطمہ حسن عصر حاضر میں پاکستانی معاشرے کی صورتحال اور جامعات میں کتب بینی کے فروغ کے حوالے سے بہت سرگرم ہیں ان کے نزدیک کتاب ہی انسان کو انسان بناتی ہے مگر بڑے شہروں اور دیہاتوں کی آبادی کتب بینی سے دور ہو گئی ہے دیہاتوں میں شرح تعلیم کی کمی نے کتابوں کی فروخت کو متاثر کیا ہے تو بڑے شہروں میں معیار

تعلیم کی تنزلی دیکھ سکتے ہیں۔ پرائیویٹ سکولوں میں مطالعے کی عادت بالکل ترک کرادی ہے اور یونیورسٹی کی سطح تک اس بات پر توجہ نہیں دی جارہی حالانکہ مطالعہ کا بنیادی مقصد ذہنی وسعت کو پیدا کرنا ہے جو ماحول کو صاف ستھرا اور خوبصورت بنا کر جینے کا سلیقہ سکھائے۔ فاطمہ حسن اپنے اداریوں میں اپنے عہد رفتہ اور ماضی کی روایات سے رشتہ مضبوط بنانے کا بار بار درس دیتی ہیں ان کے نزدیک کامیابی اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو کتاب کے نزدیک کیا جائے اور پاکستانی سماج عصر حاضر میں اسی وقت ترقی کر سکتا ہے جب وہ مطالعہ کی عادت پختہ کرے اور کتب بینی کو فروغ دے۔

اس حوالے سے فاطمہ حسن کچھ تجاویز بھی دیتی ہیں کہ سکول اور اساتذہ کو نصابی کتابوں کے علاوہ غیر نصابی کتابوں کے مطالعے کی طرف بھی مائل کرنے کے لیے ماحول پیدا کرنا چاہیے حکومت کو محلے میں لائبریریوں کے قیام اور جہاں لائبریریاں پہلے سے موجود ہیں اس کے ماحول اور کتاب کی فراہمی کو ترجیحات میں شامل کرنا چاہئے کتب اور رسائل کی ترسیل کا شعبہ بھی توجہ چاہتا ہے خصوصاً نصاب کے اضافے کے ساتھ ماحول مطالعہ اور کتب بینی کے لیے موافق نہیں اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

فاطمہ حسن عصر حاضر میں سماجی ترقی کے لیے تعلیم اور تدریس کے پیشے کی طرف مراجعت کا درس دیتی ہیں ان کے خیال میں تعلیم اور تدریس جو کبھی مقدس فریضہ سمجھا جاتا تھا اب اس کا معاشرہ میں جو مقام تھا وہ ہم نے کھو دیا جو تعلیم سے حاصل ہوتا تھا تعلیم سے معاشرے کا ارتقا ہوتا تھا لیکن اب تعلیم کو کاروبار بنادیا ہے ہم اس سے پیسہ کما رہے ہیں تعلیم کا مقصد علم کے ذریعے دانش کا حصول تھا وہ دانش صدیوں کی تھی اور پروان چڑھاتے ہوئے آنے والی نسلوں کو منتقل کرنا پڑتی ارتقا کے عمل کو جاری رکھنے والے ذہن تیار کرسکیں تعلیم کی جگہ جہاں الفاظ کی پہچان سے ہوتی تھی وہ اخلاقیات کا سبق ایسا لازمی حصہ تھا جو بچے کے لاشعور میں پھنس جاتا بچپن ہی سے اس طرح ذہن نشین کر دی جاتی ہے یہ نقش کبھی نہیں مٹتا ہر کہانی میں اس وقت میں اخلاقیات کا کوئی پہلو ہوتا تھا اس طرح بچے اخلاقیات پر عمل پیرا ہوتے ہیں جن کی تقلید کرتے تھے۔ یہ کوئی زیادہ پرانی بات نہیں جب سے زیادہ قابل فخر شاگرد استاد کو خوش نصیبی سمجھتے تھے۔ مگر عصر حاضر میں لوگ استاد کو نہ اہمیت دیتے ہیں نہ کتاب کو اہمیت دیتے ہیں جس کی طرف فاطمہ حسن توجہ دلا رہی ہیں۔

فاطمہ حسن موجودہ تعلیمی صورت حال اور نصاب سازی کے طریقوں پر سخت تنقیدی لب ولہجہ اپناتی ہیں ان

کے نزدیک پہلے زمانوں میں نصاب ساز بہت کڑے اصولوں پر نصاب مرتب کرتے تھے مگر اب وہ صورت حال نہیں ہے۔ اب نصابی کتابوں کا کام ٹھیکوں پر دیا جاتا ہے جہاں کم بولی پر کم ترین معیار کا حصول ہی اہمیت رکھتا ہے۔ تدریس کو طبقاتی نظام کو مستحکم بنانے اور تدریس کو تجارت میں ڈھالنے کے بعد نصاب کو بھی اعلیٰ اقدار سے جدا کر دیا گیا۔ اپنی زبان و ثقافت کے ساتھ قومی یک جہتی کو بھی آنے والی نسلوں کی ضرورت نہیں سمجھا گیا جس کے واضح اثرات ہماری معاشرتی زندگی میں نظر آرہے ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ نصاب کی ترتیب و تشکیل پر توجہ دی جائے اور ایسی کمیٹی بنائی جائے جس میں ماہرین تعلیم کے علاوہ نفسیات اور دیگر سماجی علوم سے متعلق افراد شامل ہوں۔

فاطمہ حسن کے بقول

> یہ زمانہ سائنسی شعور پر زور دیتا ہے نصاب میں سماجی علوم اور سائنسی علوم کے مابین توازن ہونا چاہیے۔ آج کل جو تفریق پیدا کی گئی ہے وہ طلبہ کے لیے کسی طرح مناسب نہیں متوازن شخصیت سائنسی اور سماجی علوم کی یکساں تحصیل کے بعد ہی ممکن ہے نصاب سازی اور تعلیم و تدریس بہت ذمہ دارانہ توجہ چاہتی ہے کہ اس پر قوم کے مستقبل کا دارومدار ہے۔(۱۰)

فاطمہ حسن موجودہ تعلیمی نظام کو سخت برا سمجھتی ہیں ان کے نزدیک ہمارا تعلیمی نظام جس میں سرکاری اسکولوں اور کالجوں سے ذہین ترین بچے نکلتے تھے جو اپنی مادری زبان کے ساتھ اردو زبان پر مکمل عبور رکھتے تھے اور اتنی انگریزی سیکھ لیتے تھے کہ قواعد کی غلطی کے بغیر مراسلت کر سکیں اسے تباہ کر کے تجارتی بنیادوں پر تعلیمی ادارے قائم کیے گئے جہاں انگریزی بولنے پر اتنی توجہ دی گئی کہ بچوں کو ان کی اپنی زبان میں گفتگو کی ممانعت ہے۔ اکثر جامعات میں تمام مراسلت انگریزی زبان میں ہوتی ہے۔ اگرچہ رسمی طور پر اردو کو قبول کر لیا گیا ہے اور اب معلوماتی مواد کے تراجم کر دیے گئے ہیں۔ انگریزی کے بڑے بڑے اسکولوں کے مالکان کو دیکھیں تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ اسی طبقے کے افراد ہیں۔ جن کی مراعات کی تاریخ انگریزوں کی دادودہش سے وابستہ ہے انگریزی زبان کو سیڑھی بنا کر اقتدار اور اعلیٰ عہدوں کے حصول پر قومی زبان و ثقافت کو روندنے والے کھل کر عدلیہ کے فیصلے کے خلاف عمل کر رہے ہیں اور یہ کوئی راز بھی نہیں۔ ان کی سازشوں پر تاریخ میں ایک طویل باب ملتا ہے۔ پاکستان کی قومی زبان اردو کو جو ملک کی اکثریت بول اور سمجھ لیتی ہے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

فاطمہ حسن اردو زبان کو نظر انداز کرنے کی وجوہات پر بھی تفصیلی نظر ڈالتی ہیں اس نظر سے ان کا عصری شعور واضح ہوتا ہے وہ سماجی عوامل کو مفصل بیان کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ اگرچہ اردو کو رد کرکے انگریزی زبان کی حمایت کی جاتی ہے مگر سب جانتے ہیں کہ انگریزی ملک کے دور دراز علاقوں میں تو کیا شہر کی اوسط مضافاتی آبادی میں بھی نہیں بولی جاتی اور نہ سمجھی جاتی ہے اگر ان کے ابلاغ کی واحد زبان کو ختم کر دیا جائے تو تمام رابطے منقطع ہو جائیں گے اور ایک فیصد سے بھی کم انگریزی بولنے والا مراعات یافتہ طبقہ بآسانی ان پر حکومت کرتا رہے گا۔ اردو کی مخالفت کے پیچھے یہی عزائم ہیں جو قومی یک جہتی کی راہ میں حائل ہیں۔ اس وقت پاکستانی قوم کو اپنی شناخت پر متحد ہونے کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔

ادب معاشرے کے جذبات واحساسات کا ترجمان اور پرتو ہوتا ہے۔ معاشرے کی بقا و سلامتی کے لیے کئی شعبے مل کر کام کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک شعبہ سیاست کا بھی ہے۔ سیاست معاشرے کا ایک اہم شعبہ ہے۔ تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سیاست نے ہمیشہ معاشرے کو اور ہمارے ہمارے ادب کو براہ راست متاثر کیا ہے چنانچہ ادب، سماج اور سیاست آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ ادب اور سیاست دونوں انسانی معاشرتی زندگی کے اہم جزو ہیں۔ ادب کی بنیاد بھی معاشرے سے ہے اور سیاست کی بنیاد بھی معاشرے پر قائم ہوتی ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ادب معاشرے کا عکاس ہوتا ہے اور اس کی تلخ حقیقتوں کو واضح کرتا ہے تو اس میں معاشرے کے تمام شعبے آ جاتے ہیں۔ چاہے وہ سیاست ہو یا معیشت، تہذیب ہو یا ثقافت، سماج ہو یا سیاست ان سب کا ادب سے گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست ہمیشہ سے ادب کا اہم موضوع رہی ہے۔

اردو ادب میں ہمیشہ سے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات میں سیاست کے موضوعات اور مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ تخلیق کار اپنے عہد کی اجتماعی صورتِ حال سے اثر قبول کرتا ہے اور سیاست چونکہ سماج کا ہی شعبہ ہے لہٰذا ادیب کے قلم سے نکلنے والی تحریر اپنے عہد کی ترجمان اور سماجی وسیاسی حالات وواقعات کی عکاس بن جاتی ہے۔ فاطمہ حسن کی تحریریں بھی سیاست کے ادب و زبان پر اثرات کا احاطہ کرتی ہیں۔ سیاسی، سماجی تغیرات انفرادی سطح پر فرد کے رویوں میں تبدیلی کا باعث بنتے ہیں اور انہی انفرادی رویوں سے اجتماعی رویے متشکل ہوتے ہیں اور سماج کی ایک صورت سامنے آتی ہے۔ عصر حاضر میں ملکی سیاسی و معاشرتی صورت حال کا مشاہدہ کیا جائے تو ہمارے ہاں سیاسی عدم استحکام اور بڑھتی معاشی بد حالی ہمارے انفرادی رویوں پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوئی ہے۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک ہمیں کبھی سیاسی استحکام نہیں ملا اور نہ ہم نے معاشی طور پر خوش حالی کا دور دیکھا۔ غربت نے ہمیشہ ہمارے سماج کی اکثریت آبادی کو اپنے جال میں جکڑے رکھا اس تمام صورت حال سے ہمارے ہاں

صرف بے یقینی، خوف، بے زاری اور عدم اعتماد جیسے رویے ہی تشکیل پا سکتے ہیں۔

فاطمہ حسن کے ہاں پاکستانی معاشرے کی سیاسی و سماجی صورت حال کی عکاسی نہایت درد ناک انداز میں ملتی ہے۔ ان کی تحریروں میں اپنے سماج کی خامیوں کو دیکھنے، پرکھنے اور ان خامیوں کا حل بھی کہیں کہیں ملتا ہے انھوں نے اپنے پاکستانی سماج کو نہایت باریک بینی سے تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے "میلے میں گم" میں لکھا ہے کہ تاریخ اچھے اور برے لوگوں سے بھری پڑی ہے حالات کو انتقام کی راہ پر ڈال کر ہم برائی کو پروان چڑھاتے ہیں۔ نفرت کے الاؤ میں انسانوں کا ایندھن استعمال کرنے والوں میں اہل قلم کو شامل نہیں ہونا چاہیے۔ تشدد اور دہشت گردی کے مقابل تو اہل دانش ہی ڈٹ کر کھڑے ہوتے ہیں کیوں کہ وہ دور تک دیکھ رہے ہوتے اور آنے والی نسلوں کا مستقبل ان کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے ہر وہ تعصب جو ماحول کو آلودہ کر کے بصارت اور بصیرت کے درمیان حائل ہو جائے اہل دانش اس سے پاک ہوتے ہیں۔ کاش ہمارے سیاست دان ان کی بینائی کا سہارا لے لیتے۔ مگر انھیں تو صرف اپنی ذات اور اپنی ناک تک ہی دیکھنا ہے یہی المیہ ہماری اور سب کی تباہی کی وجہ ہے۔ اپنے شہر کراچی کی صورت حال کے بارے میں فاطمہ حسن نے متعدد جگہ لکھا ہے یہاں بھی اسی صورت حال کو موضوع بناتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ وہ پوچھتے ہیں کیا آپ کراچی میں محفوظ ہیں؟ میں کہتی ہوں اس وقت دنیا میں کہیں بھی کیا کوئی محفوظ ہے؟ ہاں! پاکستان دہشت گردی کی زد میں ہے لیکن خود میرے اپنے شہر کراچی میں اس وقت ادب اور آرٹ کی سرگرمیاں پہلے سے کہیں زیادہ ہیں۔ (۱۱)

عصر حاضر میں تہذیب و تمدن اور اپنے کلچر کی حفاظت کرنا پاکستانی قوم کی اولین ترجیح ہونی چاہیے فاطمہ حسن اسی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے کہتی ہیں کہ انسان کی دانش اور حس جمال ہی اسے دیگر مخلوقات سے اشرف اور طرز زندگی میں برتر بناتی ہے۔ دانش جو بصیرت عطا کرتی ہے اور حس جمال جو خیر کے عمل کی محرک ہے۔ فاطمہ حسن کے نزدیک یہ خوبیاں جن افراد اور اقوام میں ہوں وہ مہذب کہلاتی ہیں۔ اور ترقی کے سفر پر گامزن رہتی ہیں۔ دانش کا پیمانہ کیا ہے؟ اس کا درست جواب فاطمہ حسن کے نزدیک عصری تقاضوں کا شعور ہی اصل داش ہے۔

فاطمہ حسن نومبر ۲۰۱۹ کے اداریے میں لکھتی ہیں کہ عصری تقاضے وقت سے ہم آہنگ ہوتے ہیں وقت سے ہم آہنگ یہ ترقی و تبدیلی علمی، معاشرتی، معاشی، ثقافتی غرض ہر شعبۂ زندگی میں آنی چاہیے۔ ان دانش وروں کا تصور

وقت بھی عام افراد سے مختلف ہوتا ہے کہ انھیں وقت کی قدر و قیمت کا بہتر احساس ہوتا ہے۔ وہ وقت کو حال ہی میں نہیں، مستقبل میں بھی دیکھتے ہیں۔ اور حال کو اپنے مطابق تبدیل کرنے کی جستجو رکھتے ہیں۔ وہ وقت کو منجمد نہیں بلکہ رواں دیکھتے ہیں۔ اس طرح فرد ہو یا قوم مستقبل کی پیش بینی اور اس کی نشان دہی دانش ور کی کی بصیرت ممکن بناتی ہے ۔ اس بصیرت کے ساتھ اپنے قلم و عمل سے متحرک رہنا آسان کام نہیں۔ اس سفر میں بہت مشکل مقامات آتے ہیں ۔ ایسے افراد اور گروہ بھی ہوتے ہیں۔ جنھیں تبدیلی پسند نہیں ہوتی۔ کبھی تن آسانی کی وجہ سے تو کبھی ذاتی مفاد کے لیے رکاوٹیں حائل کرتے ہیں۔ سازشوں کے جال بنتے ہیں۔ مگر اہل دانش تمام ذاتی و گروہی مفادات سے بالاتر ہو کر اس سچ کا فکری اور عملی اظہار کرتے رہتے ہیں۔ جو ان کی دانست میں بنی نوع انسان کے لیے ب درست ہوتا ہے یہ افراد تاریخ بناتے ہیں اور تخلیقات و ایجادات کا ایسا سرمایہ چھوڑتے ہیں جو انسانیت کے مقام کو ابد تک بلند رکھتا ہے اور قوموں کو ثروت مند بناتا ہے۔ (۱۲)

پاکستانی سماج میں ثقافت کی بازیافت اور اس کی اہمیت کے متعلق فاطمہ حسن نے بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ دسمبر ۲۰۱۷ء کے اداریے میں لکھتی ہیں کہ کسی بھی قوم کی شناخت اور جغرافیے کے ساتھ اس کی ثقافت ضروری ہے۔ اور ثقافت کا مظہر زبان ہے۔ پاکستان کی سرزمین جو جغرافیائی طور پر لوک ثقافتوں سے مالامال رہی ہے اسے ایک ثقافت میں ڈھالنے کا کردار اردو زبان انجام دے سکتی ہے جس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنانے اور ان کی ثقافتوں کو جذب کرنے کی فطری صلاحیت مسلمہ ہے۔ یہ زبان کسی جغرافیے میں قید نہیں رہی۔ نہ اس کی فکری پرواز محدود الفاظ کے حصار میں آئی۔ جبھی برعظیم کے ہر خطے میں اور بین الاقوامی طور پر اس خطے کے باسیوں نے ابلاغ کے لیے اسی زبان کو اپنایا۔ اردو کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ابتدا ہی سے بین اللسانی، علمی و ادبی ورثے کو اس میں منتقل ہونے کی سہولتیں میسر آتی رہیں۔ اس لیے فاطمہ حسن اردو زبان کی ترویج کو ضروری خیال کرتے ہوئے عصر حاضر میں اس زبان کی مسلمہ اہمیت کو بار بار اجاگر کرتی ہیں۔ (۱۳)

جس طرح ہر شعبۂ زندگی ترقی کے لیے سہولیات و مراعات چاہتا ہے ایسے ہی ادبی شعبے کی ترقی و ترویج کے لیے بھی سہولیات ضروری ہوتی ہیں۔ دورِ حاضر میں ادب کو درپیش مسائل میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ادب کی ترقی و ترویج کے لیے سہولیات کی شدید کمی ہے۔ قومی و ملکی سطح پر ادب کے فروغ کے لیے کیے جانے والے اقدامات ناکافی

ہیں۔ذرائع ابلاغ کی غیر یقینی صورتِ حال محض تفریح کا کام کرتی ہے۔ملک میں کسی بھی سطح پر ادبی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ادب کے فروغ کے لیے نہ انفرادی سطح پر کوئی اقدامات اٹھائے جارہے ہیں اور نہ ہی اجتماعی سطح پر کوئی اپنی ذمہ داری پوری کررہے ہیں۔اس صورتِ حال میں ادیب پر دوہری ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔لہٰذا اسے اپنے مقام و مرتبہ کو سمجھنا ہو گا۔فاطمہ حسن بار بار اپنے اداریوں میں عصر حاضر میں ادیب کے کردار کی اہمیت اور اس کے تحرک پر زور دیتی ہیں کہ ہماری قوم کی بقا اور عصر حاضر میں جدید مسائل سے نپٹنے کے لیے ادیب کو سامنے آکر ان مسائل کا سامنا کرنا ہی ہو گا۔

عصر حاضر میں پاکستانی معاشرہ جن مسائل سے دوچار ہے ان مسائل کا اظہار تحریری صورت میں ہونا چاہیے فاطمہ حسن کو اس بات کا گہرا ادراک ہے وہ تحریر کی اہمیت سے آگاہ ہیں اس لیے وہ تحریر کی مختلف اقسام پر ماہرانہ رائے رکھتی ہیں۔اپریل ۲۰۱۶ء کے اداریے میں لکھتی ہیں کہ تحریر ایک مشکل کام ہے اور آسان بھی۔مشکل اس وقت ہوتی ہے جب قلم نہیں اٹھایا جاتا۔آسان اس وقت ہوتی ہے جب قلم اٹھانے والے کو پتا ہو کہ اس نے آغاز کیسے کرنا ہے اور اختتام کیا ہو گا؟عصر حاضر میں تخلیقی تحریر کی اہمیت بہت زیادہ ہے اس میں لکھنے والا گھنٹوں سوچتا ہے۔اور کئی کئی بار آغاز کو بدل دیتا ہے۔مراسلت میں ایسا نہیں ہوتا۔بنا بنایا انداز ہے۔رٹے رٹائے فقرے،آغاز و اختتام ہمیشہ ایک سا ہوتا ہے۔اس لیے اس کی پیشہ روانہ تربیت ضروری ہے۔(۱۴)

فاطمہ حسن کہتی ہیں کہ مراسلت ایسی زبان میں ہونی چاہیے جو عوام کی زبان ہو،خصوصاً ان شعبوں میں جو براہ راست عوام سے تعلق رکھتے ہیں قومی سطح پر جو رابطے کی زبان ہے وہی سرکاری زبان ہونی چاہیے۔(۱۵)فاطمہ حسن بار بار سرکاری زبان کی جانب مراجعت کا درس دیتی ہیں۔اردو میں اگر انگریزی کے بجائے دیگر پاکستانی زبانوں کی بھی آمیزش کر دی جائے تو بھی ابلاغ ہو ہی جاتا ہے۔مگر انگریزی کے نامانوس الفاظ عوام کی فہم سے بالاتر ہوتے ہیں۔

فاطمہ حسن کو اس بات کا شدت سے ادراک ہے کہ عصر حاضر میں جدید علوم میں استفادہ کرنا چاہیے اس لیے تراجم کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔علوم خصوصاً سائنسی علوم کی قومی زبان میں تراجم کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے علم کا مقصد طالب علم کو صرف معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ فکر و مباحث کی جہات کو روشن کرنا بھی ہے۔فکر کی آواز بنانے کے لیے ایک ایسی زبان پر عبور ضروری ہے جس میں ہم خواب دیکھ سکتے ہیں۔فکر خواہ سائنسی علوم کی ہو یا عمرانی

علوم کے لیے، اس کا آغاز دھندلاہٹ سے ہوتا ہے۔ اس دھندلاہٹ کو شبیہ میں بدلنے کے لیے الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جب ہم ترجمہ کرتے ہیں تو صرف علم کو اپنی زبان میں نہیں ڈھالتے بلکہ اس کے سیاق و سباق کو بھی اپنے تناظر میں ذہنوں کے لیے قابل قبول بناتے ہیں۔ مختلف تمدن میں بہت سے ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن کے تراجم یا تو بے معنی ہو جاتے ہیں یا بدل جاتے ہیں۔ اپنی زبان پر عبور حاصل کیے بغیر کسی دوسری زبان میں تعلیم حاصل کرنے میں یہ امکان قوی ہوتا ہے کہ یہ تعلیم صرف رٹنے رٹانے یا سطحی فہم تک محدود رہ جائے گی۔ ایسا ہی ہمارے نظام تعلیم میں ہوا ہے۔ جہاں طلبہ نے کسی بھی زبان پر دسترس حاصل نہیں کی۔

فاطمہ حسن نے جولائی ۲۰۱۶ کے اداریے میں تراجم کی اہمیت پر مدلل بات کی ہے۔ ان کے نزدیک تراجم صرف ایک زبان سے نہیں ہوتے اس وقت دنیا کی متعدد زبانوں میں سائنسی علوم میں پیش رفت ہوئی ہے۔ ان کا انتخاب قومی زبان میں منتقل کر کے ہم اپنے طلبہ کی بڑی تعداد کو صحیح معنوں میں استفادے کا موقع فراہم کر سکتے ہیں۔ جب علوم تک تمام طلبہ کی رسائی یکساں ہوگی تب ہی قومی ترقی کی راہ کشادہ ہو سکے گی۔ حالیہ صورت حال یہ ہے کہ تعلیم کو طبقاتی استحصال کا ذریعہ بنا کر آبادی کے بڑے حصے کو پسماندگی میں دھکیل دیا گیا ہے اب تو درمیانہ طبقہ جو معاشرے کا ذہن ہوتا تھا وہ بھی تعلیم سے محروم ہو گیا ہے۔(۱۶)

فاطمہ حسن اپنے آباو اجداد کی روایات کی پیروی کرنے کا درس دیتی ہوئے بتاتیہیں کہ ہمارے اکابرین جو علم کے ساتھ دانش بھی رکھتے تھے اور علم و دانش کی ترویج چاہتے تھے انہوں نے اپنی قومی زبان میں تعلیم اور تراجم پر خصوصی توجہ دی جس کی بڑی مثال جامعہ عثمانیہ کی ہے فاطمہ حسن تمام بڑے اداروں اور تمام شخصیات کا تعارف بھی دیتی ہیں بلکہ انھوں نے تراجم کے لیے گراں قدر کام کیا ہے۔

فاطمہ حسن کے اداریے عصر حاضر کے رویوں سے متعلق انسانی تاریخ کے عکاس ہیں وہ لکھتی ہیں کہ عہد حاضر میں عالمی دن منانے کا رواج عام ہو گیا ہے یہ عالمی دن متعدد حوالوں سے مختلف تاریخوں میں منائے جاتے ہیں اپریل کی ۲۳ تاریخ "کتابوں کے عالمی دن" کے لیے مخصوص ہے کتابوں کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے آج جب برقی ذرائع ابلاغ ہر گھر میں داخل ہو چکے ہیں اور لائبریریاں گھروں سے خارج ہوتی ہیں۔ کتابوں کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی تمام کوششیں قابل قدر ہیں باریک بینی سے دیکھا جائے تو الیکٹرانک میڈیا نے کتابوں کی ضرورت کو ختم نہیں کیا ہے بلکہ

کتابوں کے مطالعے کو عام کیا ہے جو ان برقی آلات پر منتقل ہو رہے ہیں وہ کتاب ہی سے لیے جا رہے ہیں کتابیں جن کی تاریخ انسانی تاریخ سے وابستہ ہے کتابوں سے پہلے کا عہد جہالت اور دور تاریکیکہلاتا ہے اس زمانے میں جہالت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ فاطمہ حسن عصر حاضر میں کتاب کی اہمیت اور برقی میڈیا پر کتاب کی منتقلی کو موضوع بناتی ہیں۔(۱۷)

فاطمہ حسن کتابوں کی تاریخ رقم کرتی ہیں ان کے نزدیک تبدیلی ایک مسلسل عمل ہے دنیا کی تاریخ میں ٹھہراؤ کا کوئی دور نہیں آیا۔ جب سے دنیا وجود میں آئی ہے ان کی تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے تاریخ روزنامچے اور واقعہ نگاری کی صورت میں ماخذ کتابوں سے تو دستیاب ہوتے ہیں ان کے ساتھ ایک متوازی حوالہ ادب کا بھی ہوتا ہے یہ ادب ہی ہے جو تاریخ کی گواہی دیتا ہے اور روزنامچہ اور واقعہ نگاری جو مورخ نے کی ہے کس حد تک درست ہے اس کی سند ادب سے ملتی ہے۔ کیونکہ تاریخ کو لکھوانا اور لکھی ہوئی تاریخ کو مٹانا اہل اقتدار کا شیوہ رہا ہے۔ ادیب اور دانشور معاشرے کی سچی تصویر کشی کرتے ہیں یہ وہ افراد ہیں جو ظاہر کے ساتھ باطنی سچائی کو بھی محسوس کر سکتے ہیں۔

فاطمہ حسن عصر حاضر کی نبض شناس ہیں انہیں بدلتے عہد کی رفتار کا اندازہ ہے اپنا ایک اداریہ "کروٹیں بدلتا عہد" کے نام سے ستمبر ۲۰۱۸ء میں لکھتی ہیں ہم ایسے دور میں داخل ہو گئے ہیں جب عہد کی کروٹیں محسوس کرنے کے لیے غیر معمولی حساسیت کی ضرورت نہیں چاہے وہ جغرافیائی حد بندی ہوں یا موسم کی تبدیلی، سیاسی مصلحتیں ہوں یا اقتصادی مجبوریاں، سماجی رشتے ہوں یا معاشی تعلقات ادبی روایات کی تیز رو اور تیز رفتار تبدیلی کی لہریں ہر شعبہ زندگی میں ہلچل مچا رہی ہیں۔(۱۸)

فاطمہ حسن سوال اٹھاتی ہیں کہ منصوبہ بندی کرنے والے ارباب اختیار اتنی بصیرت رکھتے ہیں کہ اپنے عہد کے تقاضوں اور آنے والے وقت کی تبدیلیوں کا ادراک کر سکیں اس کے لئے دانشورانہ دور اندیشی اور وسعت نظری بہت ضروری ہے۔ ان کے نزدیک تبدیلی کی تمنا اور دعویٰ اس وقت تک درست نہیں جب تک وہ عصری تقاضوں کے مطابق نہ ہو عصری تقاضے کیا ہیں؟ یہ ایک وسیع موضوع ہے اور تمام شعبہ ہائے زندگی کے صاحبان بصیرت ان ستاروں کو پہچان سکتے ہیں جو ان کے شعبے میں یوں ہیرا دکھا رہے ہیں جیسے پرانے زمانے میں میر کارواں اس مقصد کے لیے ستارہ شناسوں کو ساتھ رکھتا تھا تاہم قدیم ترین علمی و ادبی روایات اس سے وابستگی کی بنیاد پر ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اپنی اقدار و ثقافت کی ایسی واضح شناخت جو عالمی سطح پر بحیثیت قوم ممتاز کر سکیں ایک لازمی عمل ہے جسے تبدیلی

سے ہم آہنگ ہونا چاہئے ہم دنیا کے کسی بھی خطے میں جائے یا کوئی بھی ہمارے ہاں آئے ایک قوم کو اس کیا علی اقدار اور ثقافتی جمالیات کی بنیاد پر پہچان سکے۔ انسانی تہذیب کا سفر دراصل اس کی اقدار احساس کی بلندی کا سفر ہے جن قوموں نے اس بلندی کو حاصل کیا وہ معتبر ہوئیں آفات سماوی اور جنگوں کی تباہی نے اگر انھیں متاثر کیا بھی تباہ حالی و غربت کے باوجود غیر معتبر نہیں گردانی گئیں اور اس بحران سے نکلنے پر کامیاب ہوئیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تہذیب و ثقافت کے استحکام میں بطور قوم متحد رہیں اور غیر متزلزل نہیں ہوئیں۔(۱۹)

اس سلسلے میں فاطمہ حسن جاپان، چین اور ایران کی مثالیں دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہمیں علمی اور تہذیبی سفر میں حاصل شدہ وراثت کو اپنا فخر سمجھنا چاہیے جو ادبی اثاثوں اور ثقافتی جمالیات پر مشتمل ہے اور ان تمام اقدامات سے گریز کرنا چاہیے جو ان کے لیے نقصان دہ اور قومی وقار کے منافی ہو۔ اکتوبر ۲۰۱۸ء کے اداریے میں لکھتی ہیں کہ ایک عہد کی تبدیلی جن اہل دانش کی مرہون منت ہوتی ہے وہ تاریخ میں امر ہو جاتے ہیں۔ عالمگیریت نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا اور یوں زبان و ادب بھی اِس کی زد میں آئے۔ عالمگیریت کے قیام کی ایک صورت ایک بین الاقوامی زبان کو تمام دنیا میں رائج کرنے کی پالیسی ہے اور اِسی کے نتیجے میں دیگر شعبوں پر مغربی یعنی حکمرانوں کی طرح عالمگیر زبان بھی مغربی یعنی انگریزی ہی انتخاب کی گئی۔ اِس کی ترویج و اشاعت کر کے اس کے فروغ کو ممکن بنایا گیا۔ انگریزی کی بطور عالمی زبان اہمیت نے اردو ادب کو بھی متاثر کیا۔ زبان میں حرفی و نحوی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان ادب میں موضوعات، اسلوب، متنوع تہذیب، غیر ملکی زبان، اور ہیئت کی تبدیلی بھی عالمگیریت کے اثرات کی مرہون منت ہے۔(۲۰)

عالمگیریت کے تحت ہی اردو ادب میں نئے نئے موضوعات شامل ہوئے۔ نئے پیکر، ہئیت کے سانچے اور نئی تکنیکیں بھی عالمگیریت کے اسی ردعمل کا نتیجہ ہیں یعنی عالمگیریت نے اردو زبان و ادب کو فکری و فنی ہر دو انداز سے متاثر کیا۔ اور یوں دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح عالمگیریت کے زیرِ اثر ہونے والی تبدیلیوں نے اردو زبان و ادب پر بھی گہرے اثرات چھوڑے۔ عالمگیریت کا عمل عالمی تہذیب و ثقافت، زبان و ادب اور سماج و سیاست کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے اور یہی عمل بڑی تیزی سے ہمارے معاشرے کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ ہماری بدلتی ہوئی ملکی سیاسی و سماجی صورت حال، معاشرتی و تہذیبی روایات، اخلاقی نظام اور زبان و ادب کے زیر اثر ہیں۔ ہمارے ہاں کئی ناقدین نے عالم گیریت کے اِس عمل کو اور اس کے ردِ عمل کو شدت سے محسوس کیا اور اپنی تخلیقات میں ان عالمگیر تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں کے ہمارے معاشرے پر اثرات کو پیش کیا۔ اور اپنی عصری ذمہ داری پوری کی۔ فاطمہ حسن اسی ذمہ داری کو نباہتے ہوئے ہر مسئلے کو اپنے اداریوں میں پیش کرتی رہی ہیں۔

فاطمہ حسن نے درست سمت کی نشاندہی کرتے ہوئے پاکستانی سماج میں تعلیم کے ناقص نظام پر گہری تنقید کی ہے کہ ہمارے متوسط یا غریب طبقے کے ذہین بچوں کو صرف انگریزی کے لہجے سے ناواقفیت کی بنا پر احساس کم تری میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور ان سے کم تر ذہن رکھنے والے بڑی بڑی فیسیں ادا کر کے اور روایات سے ناتا توڑ کر پاکستانی ثقافت اور پاکستانیت سے دور ہوتے گئے ہیں اس سے پاکستانی قومیت کا تصور دو سطحوں پر کم زور ہوا ہے پہلی سطح وقار کی ہے اور دوسری سطح ذہنی صلاحیت کی ہے۔ فاطمہ حسن کہتی ہیں کہ اس سماجی اور طبقاتی کش مکش سے ہمیں جو نقصان پہنچنا تھا وہ پہنچ چکا ہے اب سنبھلنے کا وقت ہے اور ہمیں اپنی ملکی شناخت اور قومی سلامتی کے متعلق بروقت فیصلہ کرنا ہو گا تاکہ ہم ترقی کر سکیں۔

تبدیلی کا عرصہ اپنی وسعتوں میں فکر و معنی کے وہ اور اوراق سمیٹے ہوئے ہوتا ہے جس کی تحریر گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ واضح اور با معنی ہوتی چلی جاتی ہے اپنے وقت میں انہیں جو عملی جدوجہد کرنا پڑتی ہے اس میں ایک تلخ تجربہ ان رجعت پسند اور مفاد پرستوں سے نمٹنے کا بھی ہوتا ہے جنہیں نے اپنے ذاتی مفاد سے آگے کچھ نہیں سوجھتا۔ وہ تبدیلی قبول کرنے پر نہ صرف یہ کہ تیار نہیں ہوتے بلکہ اس کی راہ میں رکاوٹیں حائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اپنے ہونے کا احساس اور ایک عہد میں ہونے کا احساس وہی دلاتا ہے جو مثبت تبدیلیوں میں حصہ دار ہوتا ہے جو روح عصر کو محسوس کر سکتا ہے اور آنے والے وقت کے تقاضوں کا نہ صرف ادراک رکھتا ہے بلکہ انہیں پورا کرنے کا شعور بھی بیدار کرتا ہے۔ فاطمہ حسن اس سلسلے میں کئی مشاہیر کی ذاتی زندگیوں کو بطور حوالہ بھی پیش کرتی ہیں۔

فاطمہ حسن عصر حاضر میں فنون لطیفہ کی اہمیت اور معاشرے میں اس کی اہمیت پر زور دیتی ہیں اور کہتی ہیں کیا کوئی معاشرہ ان فنون کے بغیر مہذب کہلا سکتا ہے یہ سوالات ہر دور میں سوچنے والے ذہن میں اٹھتے رہے ہیں خصوصاً ان ادوار میں جب سماج ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو اور آفات سے دوچار ہوتا ہے جب بھی تخریبی قوتیں انتشار پھیلاتی ہیں تو اہل فنون ہی ان سے مذمت کرتے نظر آتے ہیں۔

فاطمہ حسن آزاد کے عصری شعور کے متعلق جب رائے دیتی ہیں تو دراصل یہ ان کا اپنا شعور ظاہر ہوتا ہے وہ لکھتی ہیں کہ

> آزاد ایک ایسے دور کے نمائندہ ہیں جب ایک عہد نے کروٹ لی
> عصری آگاہی اور بدلتے ہوئے عہد کے تقاضوں کا شعور بیدار کرنے
> میں آزاد اور ان کے ہم عصروں کا بڑا حصہ ہے۔(۲۱)

فاطمہ حسن نے ان نابغۂ روزگار شخصیات کی تعلیمات کو پیش کیا ہے جیسے آزاد کے بارے میں لکھتی ہیں کہ وہ عصری شعور سے بہرہ ور تھے۔ فاطمہ حسن مزید لکھتی ہیں کہ ان کا عہد، وہ عہد ہے جب برصغیر میں سیاسی سماجی تعلیمی اور ادبی تحریکوں کی رہنمائی ایسے صاحب دانش اور اہل قلم کر رہے تھے جو روشن خیال تھے۔ سرسید حالی شبلی آزاد تعلیم اور ادب دونوں میدانوں میں حالات کے تقاضوں کا ادراک رکھتے تھے، اور عملی اور تحریری طور پر بھرپور کردار ادا کر رہے تھے۔ ان کی روشن خیالی برصغیر میں فکری وسماجی انقلاب کی بنیاد بنی حالی اور آزاد نے تاریخ ادب اور شاعری کے ساتھ بچوں کے لیے تدریسی کتابیں تحریر کیں ان دونوں نے لڑکیوں کے لیے بھی تدریسی کتابیں تحریر کیں جو اس وقت ناپید تھیں۔ یہ اس سماج کی ضرورت تھی جو انھوں نے پوری کی۔ اب ہمیں اپنے سماج کی ضرورت کے مطابق چلنا ہو گا۔

> فاطمہ حسن مزید لکھتی ہیں کہ یہ وہ عہد ہے جب برصغیر میں سیاسی سماجی تعلیمی اور ادبی تحریکوں کی رہنمائی ایسے صاحب دانش اور اہل قلم کر رہے تھے جو روشن خیال تھے۔ سرسید حالی شبلی آزاد تعلیم اور ادب دونوں میدانوں میں حالات کے تقاضوں کو سمجھتے تھے، اور عملی اور تحریری طور پر اپنا بھرپور کردار ادا کر رہے تھے۔ ان کی روشن خیالی برصغیر میں فکری وسماجی انقلاب کی بنیاد بنی حالی اور آزاد نے تاریخ ادب اور شاعری کے ساتھ بچوں کے لیے تدریسی کتابیں تحریر کیں ان دونوں نے لڑکیوں کے لیے بھی ایسی تدریسی کتابیں لکھیں جو اس زمانے کا تقاضا تھا جنھیں معاشرتی سطح پر قبول بھی کیا گیا۔(۲۲)

معاشرہ مسلسل تغیر پذیر رہتا ہے اور تبدیلی وانقلاب اس کے لیے ضروری ہیں۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں کئی قسم کے سماجی وسیاسی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی اپنے ساتھ نئے مسائل لے کر آتی ہے۔ اس لیے ان مسائل کو سمجھنے کے لیے ایسے ذہن وفکر کی ضرورت ہوتی ہے جو ان جدید مسائل کا احاطہ کر سکے اور ان کی نشاندہی کر سکے۔ یہی سیاسی

وسماجی تبدیلی ادب کی اصناف کو بھی متاثر کرتی ہے اور اس میں بھی کئی قسم کے نئے موضوعات ومسائل کو پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ انور شعور کے عصری شعور کے متعلق کہتی ہیں کہ ان کے رویے میں تصادم نمایاں ہے وہ تصادم جو ماحول اور اقدار سے ہے جو روایت پرست معاشرے میں ان کے لیے پیدا کیا ہے اسی لیے مفاہمت نہیں کر پاتے تو تلخ ہو جاتے ہیں ان کی شاعری میں تلخی گھلی ہوئی ہے مگر شیرینی بیان کے ساتھ اس تلخی میں گہرے طنز کا ذائقہ ہے اس تلخی اور طنز کا نشانہ خود ہی اپنے آپ کو بناتے ہیں کسی اور کو نہیں۔ قاری ان کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے اور حیران رہ جاتا ہے کہ ایسی بھی واردات لکھی جاسکتی ہے اور اتنی بے تکلفی سے لکھی جاسکتی ہے۔

فاطمہ حسن عصر حاضر کے سماجی مسائل کو بیدی کی کہانیوں کے ذریعے واضح کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہمارے سماج میں بیٹے کی پیدائش پر ہر ماں کو فخر ہوتا ہے اور بیدی نے سماجی مسائل کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ بیدی عورت کی عظمت سے آگاہ ہیں۔ وہ عورت کی عظمت اس بات سے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آخر عورت ہی تو مرد کو جنم دیتی ہے۔ تو پھر عورت کے ساتھ سماجی سطح پر بہتر سلوک ہونا چاہیے۔ فاطمہ حسن بیدی کے اس رویے پر غصے کا اظہار کرتی ہیں کہ گویا بیدی کے نزدیک عورت کی اصل اور واحد قوت لڑکے کو جنم دینا ہے۔ بیدی کے نزدیک بیٹا پیدا کرنے والی ماں کو معاشرے میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جبکہ بیٹیاں پیدا کرنے والی ماں کو حقیر اور منحوس سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ بیدی اس عورت پر رحم کھاتے ہیں۔ بیدی کا عورت کے بارے میں یہ عمومی رویہ ہے اور اپنی کہانیوں میں انھوں نے متعدد مقامات پر ہر طبقے کی عورت کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ وہ عورت کو کسی مختلف حیثیت سے نہیں دیکھتے۔(۲۳)

فاطمہ حسن کو سماجی سطح پر یہ ادراک ہے کہ عصر حاضر کا ادیب ان مسائل سے نبر آزما ہے وہ اپنے ملک کے ساتھ ساتھ دیگر اسلامی ممالک کا بھی احساس کرتے ہیں۔ جیسے زہرا نگاہ کے بارے میں لکھتی ہیں کہ بدصورت سچائیاں، خوبصورت نظموں میں لکھنا، اپنے زخم ادھیڑ کر خود دینے کی اذیت سے گزرنے کا عمل ہے۔ زہرا نگاہ عراق ہو یا افغانستان، ہمارا ملک پاکستان ہو یا اس بے اماں دنیا میں اجڑتا ہوا کوئی بھی شہر، وہ اس کا کرب کو محسوس کرتی ہیں پھر منظوم کرتی ہیں۔ یہ نظمیں شہر آشوب نہیں ہیں۔ یہ نظمیں عصری آشوب ہیں۔ زہرا نگاہ کی نظم "ایک منتشر نظم" کا تجزیہ کرتے ہوئے فاطمہ حسن کہتی ہیں کہ اس نظم میں انھوں نے پراگندہ ماضی، حال اور مستقبل کے اندیشے کو اس

طرح منظوم کیا ہے کہ اس انتشار کی کیفیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ جس میں ہم جی رہے ہیں۔ حکم رانوں کی سفاکیاں، امیروں کی خود غرضیاں، عوام کی نادانیاں، محکوموں کی بے بسی، حساس شعرا کی کیفیات، بچوں کا مستقبل اور اندیشے، بہت کچھ اس نظم میں منتشر ذہنی کیفیت اور خواب کا سہارا لے کر لکھ دیا گیا ہے۔ اسی طرح زہرا نگاہ کی نظم "فراق" میں غیرت کے نام پر باپ کے ہاتھوں قتل ہونے والی بیٹی پر ہے۔ اس میں درد کی کیفیت اتنی شدید ہے کہ اسے رقت انگیز نوحہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہمارے معاشرتی المیے پر عورت کی بے بسی اور قبیح رسموں کی بربریت ایسے بیان کی ہے کہ سماج کا ہر عنصر واضح کھل کر سامنے آتا ہے۔(۲۴)

فاطمہ حسن کی کہانیوں میں بھی معاصر صورت حال کی عمدہ عکاسی ملتی ہے۔ فاطمہ حسن سماج کے اس رویے کا مکمل ادراک رکھتی ہیں۔ کہ سماجی سطح پر عورت کو کوئی وقعت حاصل نہیں ہے۔ وہ سماجی تلخ حقائق کو اپنی کہانیوں میں پیش کرتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں عورتوں کے طرز زندگی، ان کے مسائل اور ان پر ہونے والے جبری رویوں کا اظہار ملتا ہے۔ فاطمہ حسن تمام سماجی،، سیاسی، ادبی مسائل، رجحانات اور میلانات کا مکمل شعور جھلکتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں طبقاتی کش مکش موجود ہے۔ فاطمہ حسن کی کہانی "چھوٹے بڑے لوگ" میں سماجی طبقاتی کش مکش کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں معاشرے کے ایک اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو کہ تقریباً ہر سماج کا مسئلہ ہے یعنی کہانی میں طبقاتی نظام کی کش مکش کو عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کہانی نہایت اختصار سے تحریر کی گئی ہے جس میں دو کردار دکھائے گئے ہیں۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ لڑکی کا تعلق امیر خاندان سے ہے وہ سماجی کش مکش میں بری طرح پھنسی نظر آتی ہے۔ کہانی میں اس لڑکی کی ذہنی ونفسیاتی کش مکش کو موضوع بنایا گیا ہے۔(۲۵) لڑکے کا کردار مکالمے کے طور پر کہانی میں سامنے آتا ہے۔ کہانی میں دوسرا سماجی پہلو دکھاوے کا سامنے آتا ہے۔ فاطمہ حسن اس افسانے میں خوبصورتی سے تصنع وبناوٹ کا پردہ چاک کرتی ہیں کیونکہ تعلقات کا استعمال کر کے اونچا مقام حاصل کرنا اس معاشرے کا عام چلن بن گیا ہے انھوں نے دبے الفاظ میں اس طبقاتی ظلم کی نشاندہی کی ہے۔ اور پاکستانی سماج کی عکاسی کی ہے۔

ان کی کہانیاں سماج پر گہرا وار ہیں۔ ان کی تحریروں میں ڈھکے چھپے الفاظ میں اشرافیہ طبقے کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ مثلاً افسانہ "زمین کی حکایت میں "عام طبقے کی مظلومیت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس افسانے میں شہر کے لوگوں کے متعلق

واضح لکھا گیا ہے کہ شہر کے لوگوں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں تھیں اور جن کی آنکھیں کھلی تھیں وہ بھی نظریں چار کرنے سے کتراتے رہے تھے ایسے میں زبانیں بھی بند تھیں انھیں ڈر تھا اگر وہ کچھ بولے تو اسے آنکھوں کا دیکھا نہ سمجھا جائے البتہ کان سب کے کھلے تھے اور شہر کے حاکم کی طرف سے اعلان تھا کہ جو کچھ اس کی طرف سے کہا جا رہا ہے وہ ضرور سنا جائے۔ پھر ان کے پاس سننے کے سوا کچھ رہا بھی نہیں تھا۔ شہر کے حاکم کی طرف سے کچھ لوگ مقرر کر دیے گئے تھے جو مسلسل کچھ نہ کچھ کہتے رہتے تھے جن کی اکثر باتیں شہر کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ مگر شہر کے حاکم نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جو باتیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں وہ ضرور سنی جائیں کہ یہ سب کچھ اس لیے کیا جا رہا ہے کہ آنکھوں اور زبانوں کی طرح کانوں کو بھی اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ سن کر بھی نہ سن سکیں۔ (۲۶) یعنی کہانی میں شہر کے لوگوں کو حاکموں کی بات پر گونگے بہرے بن کر رہنے اور سماج کے خلاف زبان بندی کی تلقین ان سماجی مسائل کی عکاسی ہے جس سے اس وقت کا پاکستانی معاشرہ دوچار ہے۔ ان کے ہاں پاکستان کی معاصر صورت حال بہت عمدگی سے نظر آتی ہے۔

فاطمہ حسن اپنی کہانیوں میں پاکستان کے بیشتر سماجی موضوعات کو ایک ادیب کی نظر سے دیکھتے ہوئے واضح کرتی ہیں۔ پاکستان کی عصری صورت حال بہت دگر گوں ہے اس کا اندازہ فاطمہ حسن کی کہانیوں سے ہوتا ہے۔ پاکستان کو جو چند بڑے مسائل درپیش ہیں ان میں بدعنوانی سب سے پہلے نمبر پر ہے۔ چند ادارے بدعنوانی کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں، اگر ان کو صحیح کر دیا جائے تو ملکی حالات بالکل بدل سکتے ہیں جیسے، پولیس اور دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کا نظام شفاف بنانے کی اشد ضرورت ہے، اس کے ساتھ ساتھ قانونگے اوروں اور عدالت کے نظام کو بہتر بنانے کی زبردست گنجائش موجود ہے۔ اس کے علاوہ بجلی و پیٹرولیم کی فراہمی کے ادارے، ٹیکس جمع کرنے والے ادارے، کسٹمز، تعلیم و صحت سے متعلق ادارے، زمین و جائیداد کا انتظام و انصرام کرنے والے ادارے، ان سب اداروں میں نہایت ہی اعلیٰ درجے کی اخلاقی و پیشہ ورانہ تربیت کے ساتھ ساتھ بدعنوانی کرنے والے افراد کو قرار واقعی سزائیں بھی دی جانے کی شدید ضرورت ہے جو یقیناً ملک میں بدعنوانی کو کم کرنے اور حالات کو ملک کے موافقت میں لانے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس ضمن میں پارلیمنٹ قانون سازی کے ذریعے اہم ترین کردار ادا کر سکتی ہے، جو اداروں کو قانونی اور آئینی طاقت فراہم کرنے کا سبب ہو سکتی ہے جن کے زیادہ سے زیادہ استعمال سے حکومتی سطح پر شفاف احتساب کے ذریعے بہترین نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ان کے افسانے سماجی سطح پر مختلف موضوعات کو بیان کرتے ہیں۔ افسانہ "خریدار" مسلمان حکمرانوں کے بارے میں بنیادی فکر کے دروازے کھولتا ہے۔ مثلاً اس افسانے میں مسلمان حکمرانوں کے بارے میں سوال اٹھایا گیا ہے کہ ہر خوبصورت عمارت کو مقبرہ بنانے کا شوق ہمارے حکمرانوں کو کیوں ہو رہا ہے؟ ہندوستان میں آنے والے حکمرانوں میں ہمایوں کی قبر سے تاج محل تک قبر ہی قبر ہے۔ مسلمانوں نے اکثر فنون لطیفہ اپنے اوپر حرام کر رکھے تھے اس لیے ان کی جمالیاتی حس کو تسکین کی ایک ہی راہ ملتی تھی خوبصورت عمارتیں تعمیر کرنا پھر انھیں تراش خراش کر کے ان پر نقش و نگار سجا دینا جیسے فن کار اپنے فن کے ذریعے امر ہونا چاہتا ہے اسی طرح یہ حکمران اپنا مقبرہ بنا کر زندہ رہنا چاہتے تھے۔(۲۷) یوں فاطمہ حسن اپنی تحریروں کے ذریعے معاشرے کے متنوع خیالات کو پیش کرتی ہیں۔ جیسے ان کی کہانی "چوتھے کونے کا آسیب" ہے جس میں جھوٹے لوگوں کو بے نقاب کرنے کی ایک عمدہ کوشش کی گئی ہے یہی آسیب مختلف انسانی روپ میں متشکل ہو کر ہر عورت کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ فاطمہ حسن اپنے عہد کے سماجی شعور سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اپنے عہد کی عورتوں کو ان آسیبوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں۔ یہ چار آسیب کبھی مہربان کبھی فقیر کے روپ میں سامنے آتے ہیں فاطمہ حسن چوتھے کونے میں موجود مکار لوگوں کے آسیب سے آگاہ کر رہی ہیں اس کہانی میں انھوں نے ہر راز افشا کر دیا ہے کسی بھی صورت میں ان لوگوں کو قابل اعتبار نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ سماجی سطح پر یہ لوگ دوسروں کی ذات کا نقصان کرتے ہیں۔(۲۸)

سیاسی، سماجی تغیرات انفرادی سطح پر فرد کے رویوں میں تبدیلی کا باعث بنتے ہیں اور انہی انفرادی رویوں سے اجتماعی رویے متشکل ہوتے ہیں اور سماج کی ایک صورت سامنے آتی ہے۔ عصر حاضر میں ملکی سیاسی و معاشرتی صورت حال کا مشاہدہ کیا جائے تو ہمارے ہاں سیاسی عدم استحکام اور بڑھتی معاشی بد حالی ہمارے انفرادی رویوں پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوئی ہے۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک ہمیں کبھی سیاسی استحکام نہیں ملا اور نہ ہم نے معاشی طور پر خوش حالی کا دور دیکھا۔ غربت نے ہمیشہ ہمارے سماج کی اکثریت آبادی کو اپنے جال میں جکڑے رکھا اس تمام صورت حال سے ہمارے ہاں صرف بے یقینی، خوف، بے زاری اور عدم اعتماد جیسے رویے ہی تشکیل پا سکتے ہیں۔

عصر حاضر میں پاکستان کا ایک بڑا مسئلہ دہشت گردی ہے۔ ادیب چونکہ اپنے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے اس لیے اس کے یہاں یہ سماجی صورت حال بہت واضح نظر آتی ہے اور وہ اپنے عصر کو اپنی تحریروں میں پیش کرتا ہے۔ فاطمہ

حسن کا تعلق کراچی سے ہے اس لیے ان کی تحریروں میں کراچی کے سماجی و معاشی مسائل کی پیش کش بہت زیادہ ملتی ہے۔ دورِ حاضر میں ہمارا سب سے بڑا قومی مسئلہ بدامنی اور انتشار ہے۔ دہشت گردی کے ناسور نے ہمارے معاشرے کو بری طرح لپیٹ میں لے رکھا ہے اور ملکی سطح پر قیامِ امن ایک بڑا سوال ہے۔ ان کی ایک کہانی "تم کو رقم کریں گے" کراچی کے موجودہ حالات و واقعات سے متعلق ہے۔ (۲۹) کراچی میں ڈکیتی، چوری، قتل و غارت بالکل عام اور معمولی بات سمجھی جاتی ہے اور اب تو ایسی وارداتوں میں خطرناک حد تک اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ حالیہ عصری صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو پاکستان میں دہشت گردی اور بدامنی کے عفریت کا قبضہ نظر آتا ہے اور یہ بدامنی صرف دہشت گردی کے ساتھ مشروط نہیں بلکہ ہمارے ہاں اس کی دیگر کئی صورتیں ہیں۔ فاطمہ حسن نے اپنے عہد کے اس سماجی مسئلے کو اس کہانی کا بنیادی موضوع بنایا ہے کہ ڈکیتی اور چوری جیسے واقعات بچوں کی نفسیات پر کیا اثرات مرتب کر رہے ہیں کہانی ایک عورت کے گرد گھومتی ہے جس کے گھر چوری ہو جاتی ہے اور چور بہت سارا قیمتی ساز و سامان لوٹنے کے ساتھ ساتھ کہانی کی راوی عورت کی چند خوبصورت قلم بھی چرا کر لے جاتے ہیں۔ لہٰذا ان بچوں کو ڈاکوؤں سے ایک خاص طرح کی نفرت ہو جاتی ہے اور وہ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ان ڈاکوؤں کی وجہ سے ان بچوں کا مستقبل خراب ہوا اور نئے نئے خدشات میں گھر گئے۔ فی زمانہ یہ کہانی صرف کراچی ہی نہیں پورے پاکستان کے سماجی مسائل کی عکاسی کر رہی ہے۔ ان کہانیوں سے فاطمہ حسن کے عصری شعور کی کئی تہیں کھل کر ہمارے سامنے آتی ہیں ۔فاطمہ حسن کے ہاں پاکستانی معاشرے کی سیاسی و سماجی صورت حال کی عکاسی نہایت دردناک انداز میں ملتی ہے۔ ان کی تحریروں میں اپنے سماج کی خامیوں کو دیکھنے، پرکھنے اور ان خامیوں کا حل بھی کہیں کہیں ملتا ہے انھوں نے اپنے پاکستانی سماج کو نہایت باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے۔

فاطمہ حسن گہرا عصری شعور رکھتی ہیں انھوں نے اپنے قاری کی سوچ کے لیے بہت گہرا مواد چھوڑا ہے۔ ہمارے ارد گرد جو کچھ ہو رہا ہے اس کو سوچنے کے لیے فاطمہ حسن بہت بلیغ اشارے فراہم کرتی ہیں تاکہ ہر دماغ اس کو محسوس کرے اور اپنی آنکھوں سے تمام حقیقت دیکھ سکے۔ پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ اس ملک کی ایک خاص تاریخی، سیاسی، سماجی، مذہبی و تہذیبی شناخت رہی ہے۔ اس ملک کی کل آبادی مختلف مذاہب اور زبان و تہذیب کے حامل افراد پر مشتمل ہے اس لیے اس کے مسائل بھی جداگانہ ہیں ان مسائل کا شعور فاطمہ حسن جیسی گہرا رکھتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ فاطمہ حسن، میلے میں گم، مشمولہ ماہنامہ قومی زبان دسمبر ۲۰۱۴، ص ۷۵۔

۲۔ فاطمہ حسن، اداریہ، مشمولہ ماہنامہ قومی زبان، دسمبر ۲۰۱۷، ص ۳۔

۳۔ ایضاً، جون ۲۰۱۹ء، ص ۴۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ فاطمہ حسن، کہانیاں گم ہو جاتی ہیں، کراچی: شہرزاد پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۱۲۸۔

۶۔ فاطمہ حسن، اداریہ، مشمولہ ماہنامہ قومی زبان، جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۴۔

۷۔ ایضاً، ستمبر ۲۰۱۷ء، ص ۴۔

۸۔ ایضاً، جولائی ۲۰۱۹ء، ص ۵۔

۹۔ فاطمہ حسن، کتاب دوستاں، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۸۹۔

۱۰۔ فاطمہ حسن، اداریہ، مشمولہ ماہنامہ قومی زبان، جون ۲۰۱۸ء، ص ۴۔

۱۱۔ فاطمہ حسن، میلے میں گم، مشمولہ ماہنامہ قومی زبان دسمبر ۲۰۱۴، ص ۷۵۔

۱۲۔ فاطمہ حسن، اداریہ، مشمولہ ماہنامہ قومی زبان، نومبر ۲۰۱۹ء، ص ۵۔

۱۳۔ ایضاً، دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۴۔

۱۴۔ ایضاً، اپریل ۲۰۱۶ء، ص ۴۔

۱۵۔ ایضاً۔

۱۶۔ ایضاً، جوائی ۲۰۱۶ء، ص ۴۔

۱۷۔ ایضاً، اپریل ۲۰۱۸ء، ص ۵۔

۱۸۔فاطمہ حسن، کروٹیں بدلتا عہد، ایضاً، ستمبر ۲۰۱۸، ص ۴۔

۱۹۔ ایضاً۔

۲۰۔فاطمہ حسن، اداریہ، مشمولہ ماہنامہ قومی زبان، اکتوبر ۲۰۱۸ء، ص ۴۔

۲۱۔فاطمہ حسن،کتاب دوستاں، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۱۶۔

۲۲۔ ایضاً۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۲۴۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۷۵۔

۲۵۔فاطمہ حسن،کہانیاں گم ہو جاتی ہیں، کراچی: شہرزاد پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۲۴۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۴۶۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۷۰۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۷۶۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۹۸۔

ماحصل

ماحصل

عصری شعور اپنے زمانے کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی حالات کا شعور رکھنے اور عہد حاضر کی مسلسل وقوع پذیر ہونے والی کیفیات کا ادراک رکھنا عصری شعور کہلاتا ہے۔ تغیر و تبدل ہر عہد کا خاصا ہے۔ انسان معاشرتی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ ہر نیا عہد انسانی زندگی کو مختلف سطحوں پر متاثر کرتا ہے۔ جوں جوں زمانہ ارتقا کرتا ہے توں توں انسانی زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہوتا ہے۔ عصری شعور ادب میں بھی نظر آتا ہے۔ ادب کی تمام اصناف میں لکھاری کا عصری شعور جھلکتا ہے۔ کوئی تحریر نہ تو کسی ادیب کی ماحولیاتی فضا کے اثر سے باہر رہ کر لکھی جاتی ہے اور نہ ہی زمانے کے ارتقائی اثرات سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ ادب میں ادیب کے داخلی احساسات بھی خارجی ماحول کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔ فکری بوقلمونی اور خیالات کی نیرنگی میں عصری شعور ہی کار فرما ہوتا ہے۔ عصری حسیت ، عصری آگہی اور عصری شعور... یہ سب الفاظ کسی مخصوص عہد کے اجتماعی شعور کے متنوع رجحانات کے آئینہ دار ہوتے ہیں، جن کے ذریعے روحِ عصر اپنا اظہار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ عصری شعور روایت سے انحراف کرنے کی بجائے روایت کے زندہ اور تازہ عناصر کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ عصری شعور ادب کی سمت متعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ادب کا اپنے عہد سے انسلاک، زندگی کے حقائق و معیارات کو پرکھنے اور تازہ فکر و رویوں سے ہم آہنگ کرنا عصری شعور کہلاتا ہے۔

شعور یا آگہی کے لیے حسیت کا ہونا ضروری ہے۔ عصری حسیت، عصری شعور یا عصری آگہی کا بنیادی تقاضا یہی ہے کہ کوئی موضوع بار بار دہرایا جائے۔ کسی موضوع کی تکرار کا عمل معاشرتی سطح پر ذہن نشینی کا عمل، یا INDOCRINATION کا عمل ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی مخصوص صورتِ حال میں شعرا و ادبا کے لیے کوئی موضوع توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ شعور مختلف دائروں میں موجود ہوتا ہے۔ ادب کا تعلق کسی خاص فکر و فلسفے سے نہیں ہوتا ہے۔ ادب کا تعلق معاشرے کے ہر پہلو سے ہوتا ہے۔ عصری شعور کا سب سے زیادہ اظہار ادب میں ہوتا ہے۔ ادب ہر عہد میں سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشی حقائق کا ترجمان رہا ہے۔ ادب معاشرے کے تمام داخلی و خارجی پہلوؤں کی متنوع جہات کو مد نظر رکھتا ہے۔ ان کی گہرائی میں اتر کر تمام حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ ادب

کے ذریعے ہی ایک نسل کے تجربات دوسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں۔ ادب اپنے عصر کی زبان بن جاتا ہے اور اپنے عہد کی نمائندگی کرتا ہے۔

ادیب کا عصری شعور عام عوام کے عصری شعور سے گہرا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ معاشرے کے ان پہلوؤں کو بھی سامنے لے آتا ہے جو تمام افراد کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے وقت یا عصر ایک نامیاتی کل ہے اس میں صرف حال نہیں موجود ہوتا بلکہ اس میں ماضی اور مستقبل بھی شامل ہوتا ہے۔ اس طرح ایک عام آدمی مادی ضرورت کے تحت عصری شعور رکھتا ہے۔ جب کہ ادیب کے ہاں عصری شعور تاریخ کا حصہ بن کر آنے والے وقتوں کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے۔ زمانہ تسلسل کا نام ہے اس میں ہر آنے والا لمحہ اپنے پچھلے لمحے سے مربوط ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف اور منفرد بھی ہے اور یہی انفرادیت اس کا اختصاص ہے جو اس کی شناخت قائم کرتا ہے۔ ہر دور کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اس کے اپنے تقاضے، مسائل، رحجان، سیاست، معاشرت اور تہذیب و ثقافت مختلف ہوتے ہیں۔ ان سب پہلوؤں کے فکری احساسات کو اس عہد کا عصری شعور کہا جاتا ہے۔

ہر عہد اپنے ادیب کے عصری شعور سے واضح ہوتا ہے چنانچہ فاطمہ حسن کی تحریروں میں عصری شعور کو جانچنے کے لیے اس مقالے کی بنیاد درج ذیل سوالات تھے۔

۱۔ فاطمہ حسن کی تحریروں میں سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر رد عمل کا اظہار کن صورتوں میں نظر آتا ہے؟

۲۔ فاطمہ حسن کی تحریروں میں خواتین کا معاشرتی کردار کس نوعیت میں ابھرتا ہے؟ نیز ان کی تحریروں میں عورت کو بطور انسان کس طرح دیکھا گیا ہے؟

۳۔ فاطمہ حسن کے نثری ادب میں معاصر صورت حال کی عکاسی کن صورتوں میں کی گئی ہے؟

ان سوالات کو بنیاد بنا کر اس مقالے میں طریقۂ تحقیق کے لیے ولیم ارون تھامپسن کا عصری شعور کا نظریہ لیا گیا۔ ولیم ارون تھامپسن (William Irwin Thompson) نے اپنے ایک تحقیقی مضمون contemporary Beyond consciousness میں عصری شعور کے نظریے پر کھل کر بات کی ہے۔ تھامپسن کا یہ مقالہ ۱۱ مئی ۱۹۷۱ء کو شائع ہوا (۱۰) اور ایک نظریے کے طور پر مقبول ہوا۔ تھامپسن نے اس مقالے میں عصری شعور کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا۔ وہ کہتا ہے کہ کھلا شعور ذاتی نہیں ہے۔ اور ثقافت صرف سماج کے ساتھ نہیں چلتی بلکہ

لوگوں کے رویے سماج کو برتر کرتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو عصری شعور رکھتے ہیں وہ سماج کو بہتر بنانے میں اپنا کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ انسان کا شعور انفرادیت سے اجتماعیت کی جانب سفر کرتا ہے اور اس دوران اس شعور میں تمام کائناتی اسرار و رموز شامل ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے عصری شعور کے نظریہ کی بابت درج ذیل نکات کو بنیاد بنایا ہے۔

۱۔ سماجی و معاشی مسائل کو سامنے لانا۔

۲۔ سیاسی صورت حال پر رد عمل

۳۔ خواتین کا معاشرتی کردار

۴۔ زبان و ادب کی معاصر صورت حال کو سامنے لانا

اس مقالے میں ان نکات کی مدد سے فاطمہ حسن کے عصری شعور کو دیکھا گیا۔ پہلا سوال فاطمہ حسن کے سماجی شعور سے بحث کرتا ہے جس کے مطابق ان کی تحریروں میں سماجی، سیاسی اور معاشرتی صورت حال ہمارے سامنے آتی ہے۔

فاطمہ حسن نے اپنی تحریروں میں معاشرتی اور سیاسی مسائل کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنی شاعری بلکہ اپنی نثر میں بھی بنیادی انسانی حقوق اور معاشرے میں انسانی حقوق کے لیے عملی جدوجہد کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ایک طرف پدری سماج سے بیزاری، خواتین کی سماجی حیثیت کی بحالی، تہذیبی اقدار و روایات کی پاسداری، ملک کے سماجی، سیاسی و اقتصادی مسائل کا ادراک نظر آتا ہے تو دوسری طرف کہیں کہیں ان کی تحریروں میں ان مسائل کا حل بھی نظر آتا ہے۔ فاطمہ حسن کا افسانوی مجموعہ کہانیاں گم ہو جاتی ہیں تمام کا تمام معاشرتی و سماجی سماجی مسائل کا پس منظر واضح کرتا ہے۔۔ اس مجموعے میں ان کی کل ۲۴ کہانیاں شامل ہیں اور ایک کہانی کا ترجمہ "رضائیوں والا گھر" کے عنوان سے شامل ہے۔ اس مجموعے میں شامل یہ تمام افسانے سماجی رویوں اور عورت کے مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں ان کی کہانیوں میں سادگی، سلاست اور روانی موجود ہے۔ فاطمہ حسن اپنی کہانیوں میں ہمارے اطراف کے کرداروں کو جوڑ کر کہانی بناتی ہیں۔ معاشرہ کسی عورت کا مرد سے کوئی بھی تعلق برداشت نہیں کرتا۔ جگہ جگہ معاشرتی قدغنیں عورت کے پاؤں کی بیڑیاں بن جاتی ہیں اور وہ معاشرتی ارتقا میں اپنا کردار پورے طور سے ادا نہیں کر سکتی۔ فاطمہ حسن سماج کے اس رویے کا مکمل ادراک رکھتی ہیں۔ وہ سماجی تلخ حقائق

کو اپنی کہانیوں میں پیش کرتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں عورتوں کے طرز زندگی، ان کے مسائل اور ان پر ہونے والے جبری رویوں کا اظہار ملتا ہے۔

ان کی کہانیاں سماج پر گہرا وار ہیں۔ ان کی تحریروں میں ڈھکے چھپے الفاظ میں اشرافیہ طبقے کو نشانہ بنایا گیا ہے اس کے پاکستان کے موجودہ سماجی مسائل کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ پاکستان کو جو چند بڑے مسائل درپیش ہیں ان میں بدعنوانی سب سے پہلے نمبر پر ہے۔ چند ادارے بدعنوانی کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں، اگر ان کو صحیح کر دیا جائے تو ملکی حالات بالکل بدل سکتے ہیں جیسے، پولیس اور دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کا نظام شفاف بنانے کی اشد ضرورت ہے، اس کے ساتھ ساتھ قانونکے ادروں اور عدالت کے نظام کو بہتر بنانے کی زبردست گنجائش موجود ہے۔ اس کے علاوہ بجلی و پیٹرولیم کی فراہمی کے ادارے، ٹیکس جمع کرنے والے ادارے، کسٹمز، تعلیم و صحت سے متعلق ادارے، زمین و جائیداد کا انتظام و انصرام کرنے والے ادارے، ان سب اداروں میں نہایت ہی اعلیٰ درجے کی اخلاقی و پیشہ ورانہ تربیت کے ساتھ ساتھ بدعنوانی کرنے والے افراد کو قرار واقعی سزائیں بھی دی جانے کی شدید ضرورت ہے جو یقیناً ملک میں بدعنوانی کو کم کرنے اور حالات کو ملک کے موافقت میں لانے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس ضمن میں پارلیمنٹ قانون سازی کے ذریعے اہم ترین کردار ادا کر سکتی ہے، جو اداروں کو قانونی اور آئینی طاقت فراہم کرنے کا سبب ہو سکتی ہے جن کے زیادہ سے زیادہ استعمال سے حکومتی سطح پر شفاف احتساب کے ذریعے بہترین نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

سیاسی، سماجی تغیرات انفرادی سطح پر فرد کے رویوں میں تبدیلی کا باعث بنتے ہیں اور انہی انفرادی رویوں سے اجتماعی رویے متشکل ہوتے ہیں اور سماج کی ایک صورت سامنے آتی ہے۔ عصر حاضر میں ملکی سیاسی و معاشرتی صورت حال کا مشاہدہ کیا جائے تو ہمارے ہاں سیاسی عدم استحکام اور بڑھتی معاشی بدحالی ہمارے انفرادی رویوں پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوئی ہے۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک ہمیں کبھی سیاسی استحکام نہیں ملا اور نہ ہم نے معاشی طور پر خوش حالی کا دور دیکھا۔ غربت نے ہمیشہ ہمارے سماج کی اکثریت آبادی کو اپنے جال میں جکڑے رکھا اس تمام صورت حال سے ہمارے ہاں صرف بے یقینی، خوف، بے زاری اور عدم اعتماد جیسے رویے ہی تشکیل پا سکتے ہیں۔ اسی جانب فاطمہ حسن نے نشاندہی کی ہے۔

فاطمہ حسن کا تعلق کراچی سے ہے اس لیے ان کی تحریروں میں کراچی کے سماجی و معاشی مسائل کی پیش کش بہت زیادہ ملتی ہے۔ کراچی میں ڈکیتی، چوری، قتل و غارت بالکل عام اور معمولی بات سمجھی جاتی ہے اور اب تو ایسی وارداتوں

میں خطرناک حد تک اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ حالیہ عصری صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو پاکستان میں دہشت گردی اور بدامنی کے عفریت کا قبضہ نظر آتا ہے اور یہ بدامنی صرف دہشت گردی کے ساتھ مشروط نہیں بلکہ ہمارے ہاں اس کی دیگر کئی صورتیں ہیں۔ فاطمہ حسن نے اپنے عہد کے اس سماجی مسئلے کو اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔

فاطمہ حسن کے ہاں پاکستانی معاشرے کی سیاسی و سماجی صورت حال کی عکاسی نہایت دردناک انداز میں ملتی ہے۔ ان کی تحریروں میں اپنے سماج کی خامیوں کو دیکھنے، پرکھنے اور ان خامیوں کا حل بھی کہیں کہیں ملتا ہے انھوں نے اپنے پاکستانی سماج کو نہایت باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے۔ فاطمہ حسن کے ہاں صرف مقامی صورت حال کی عکاسی نہیں ملتی کہیں کہیں ان کے ہاں عالمی سطح پر سماجی واقعات کے ذریعے عوام کو واقعات کی تفصیل بھی مہیا کی جاتی ہے۔ فاطمہ حسن کے ہاں سماجی اور معاشرتی صورت حال پر ردعمل کا اظہار ان کے اداریوں میں ملتا ہے۔ فاطمہ حسن کی ایک پوری کتاب کتاب دوستاں مختلف مضامین پر مشتمل ہے۔ فاطمہ حسن نے اپنے مضامین میں سماج کو سدھارنے کی بات کی ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین مختلف شخصیات کے حوالے سے ہیں۔ فاطمہ حسن ان شخصیات کو معاشرے کا اہم فرد گردانتی ہیں اور ان کی زندگی کو بطور نمونہ پیش کرتی ہیں۔ فاطمہ حسن چونکہ اپنے عہد کے سماجی مسائل سے آگاہ ہیں اس لیے انھیں معلوم ہے کہ کون کون سے ادیب اور لکھنے والے ایسے ہیں جنھیں اپنے عہد کے مسائل کا ادراک ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں ان ادیبوں کا عصری شعور واضح کیا ہے۔

اس مقالے کا دوسرا سوال فاطمہ حسن کی تحریروں میں عورت کو بطور فرد دیکھنے سے بحث کرتا ہے جس کے مطابق انھوں نے اپنی تحریروں میں عورت کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ فاطمہ حسن کی تحریروں میں عورت کو مرکزیت حاصل ہے۔ ان کی تحریروں میں عورت کا مقام واضح ہے کسی بھی تخلیق کار کے لیے یہ آسان ہدف نہیں کہ وہ عورت کے مسائل کو بہ بانگ دہل بیان کر سکے اور عورت کے لیے تو یہ اور بھی مشکل ہے کہ وہ اپنی کہانیوں میں جیتی جاگتی عورت کو پیش کر دے۔ فاطمہ حسن کا کمال یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں عورت سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ فاطمہ حسن کا افسانوی مجموعہ کہانیاں گم ہو جاتی ہیں تمام کا تمام عورت کے سماجی مسائل کا پس منظر واضح کرتا ہے۔

فاطمہ حسن کی تحریروں میں عورت کو مرکزیت حاصل ہے۔ ان کی تحریروں میں عورت کا مقام واضح ہے کسی بھی تخلیق کار کے لیے یہ آسان ہدف نہیں کہ وہ عورت کے مسائل کو بہ بانگ دہل بیان کر سکے اور عورت کے لیے تو یہ اور بھی مشکل ہے کہ وہ اپنی کہانیوں میں جیتی جاگتی عورت کو پیش کر دے۔ فاطمہ حسن کا کمال یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں عورت سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ فاطمہ حسن کا افسانوی مجموعہ کہانیاں گم ہو جاتی ہیں

تمام کا تمام عورت کے سماجی مسائل کا پس منظر واضح کرتا ہے۔ن کی خواتین جرات مند ہیں جو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کی ہمت رکھتی ہیں۔ یہ خواتین معاشرے میں نہ صرف اپنی شناخت تسلیم کراتی ہیں بلکہ اپنے بنیادی حقوق اور معاشرے میں انسانی حقوق کے لیے بھی عملی جدوجہد کا آغاز کرتی نظر آتی ہیں۔ حقوق نسواں کے ساتھ ساتھ سماج و معاشرے پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ان کی کہانیوں میں نسوانیت پسندی کا گہرا تاثر ملتا ہے۔ فاطمہ حسن نے اپنے افسانوں میں عورت کے لیے کھل کر لکھا ہے انھوں نے اپنی تحریروں میں ہر اس مسئلے کو جگہ دی ہے جو معاشرے پر اور خاص طور پر خواتین پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ ان کے یہاں حقوق نسواں کے حوالے سے بچیوں کی تعلیم، لڑکے اور لڑکی میں صنفی امتیاز، ونی، قرآن سے شادی اور کاروکاری جیسی سفاکانہ رسم کے حوالے سے مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔

نوکری پیشہ عورتوں کے متعلق ایسے تصورات ہمارے معاشرے کا عام حصہ ہیں۔ ایسی خواتین کو عموی طور پر خود مختار و آزاد سمجھا جاتا ہے کہ خود کمارہی ہیں ایسی عورتوں کو کون قابو کر سکتا ہے۔ ایسی عورتوں کے متعلق یہی گمان کیا جاتا ہے کہ اپنی زندگی میں وہ سب کچھ اپنی مرضی سے کرتی ہوں گی۔ حالانکہ حقیقت میں وہ اپنے گھر والوں اور خاص طور پر شوہر کی مرضی سے کام کر رہی ہوتی ہیں۔ ایسی عورتوں کی انفرادی پیشکش کی ہے۔

عورت کی وجودی شناخت مرد سے نہیں ہوتی، عورت کا وجود اس کا تصور اس کا اپنا ہے اور یہ بات ہمارے سماج میں لوگوں میں سمجھ نہیں آتی اگر عورتیں باشعور ہوں گی تو عورتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کریں گی اور انھیں وہ حقوق ملیں گے جو ان کا حق ہے۔ اپنی سوچ کا گلا گھونٹ کر معاشرے کے لگے بندھے اصولوں کی پرورش کرنے والی، اپنی خواہشات کو بھول کر رشتوں کی ترجیحات میں درجہ بندی کرنا اور اپنا آپ گنوا دینا، اپنی عمر کی پونجی دوسروں کی ضروریات پر خرچ کرنے والی اور اپنی ذات کو مٹا کر دوسروں کو پہچان دینے والی عورت کو فاطمہ حسن اپنا موضوع بناتی ہیں۔

پاکستان کی عام عورتیں جن مسائل کا شکار ہیں ان میں اہم مسائل روزگار کے مواقع نہ ہونا یا ان میں رکاوٹ، کم تنخواہ، بلا معاوضہ کام، جنسی یا نفسیاتی طور پر ہراسانی، امتیازی قوانین، سیاست میں شمولیت میں رکاوٹیں، معاشرتی تعصب و گھٹن، تشدد، رسم و رواج کی غیر ضروری خرافات، عزت کے نام پر قتل، زنا بالجبر گروہی ریپ، اغوا، گھر اور گھر سے

باہر عدم تحفظ، تعلیم کے حصول میں رکاوٹیں، خواتین کے لیے غیر مناسب تعلیمی ماحول، آزادانہ نقل و حرکت میں رکاوٹ، جبری محنت، زبردستی کی شادی، غیر معیاری رہائش، نامناسب خوراک اور بالخصوص دودھ پلانے والی ماں کی خوارک کا مناسب نہ ہونا، پروفیشن کو چننے میں پابندیاں، انصاف تک رسائی میں رکاوٹ اور کھیلوں میں شمولیت میں رکاوٹ جیسے مسائل قابل ذکر ہیں۔ ان تمام مسائل کو فاطمہ حسن اپنی تحریروں میں موضوع بناتی ہیں۔

موجودہ عورت کے بہت سارے بڑے بڑے مسائل ہیں، عورت کو جائداد میں سے حصہ نہ دینا، تعلیم کے مواقع فراہم نہ کرنا یا بہت کم مواقع دینا، جہیز کے نام پر لوٹ مار کرنا، عورت کو جہیز نہ لانے کی صورت میں زندہ جلا دینا، طلاق کے بعد دوسرے نکاح سے عورت کو ہراساں کرنا۔ آج بھی عورت کے بڑے مسائل میں شمار ہوتا ہے فاطمہ حسن کی تحریروں میں عورت کی اسی کش مکش کا تذکرہ ملتا ہے۔

قبائلی علاقہ جات میں عورت آج بھی مظلومیت کا استعارہ ہے، عورت کی قرآن پاک سے شادی، عورت کو ونی کر دینا، اوائل عمر میں شادی، گھریلو تشدد، تیزاب گردی،، عورت کی عزت کی تحفیظ، یہ سب موجودہ عورت کے مسائل ہیں، جن علاقوں میں شرح ناخواندگی زیادہ ہے وہاں پر عورت کے بے شمار مسائل ہیں اُن علاقوں میں عورت کی صحت کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ زچگی کے حوالے سے بے شمار مسائل ہیں وہاں پر عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا ہے اور بعض اوقات تو انسان بھی نہیں سمجھا جاتا۔

عورت اپنے تشخص، سوچ، فکر اور تخیلات کے لحاظ سے ویسی ہی انسان ہے جیسا کہ مرد۔ عورت صلاحیتوں کے لحاظ سے اور انھیں بہترین طریقے سے بروئے کار لانے میں بھی کسی طور مرد سے کم نہیں۔ اس میں خود اعتمادی، تجزیاتی حس، پرکھ، چیلنج کا مقابلہ کرنے کی سکت، حل نکالنے کی قابلیت اور قوت فیصلہ بھی بھرپور طریقے سے موجود ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے بھی عورت اور مرد میں کوئی بنیادی تفریق نہیں، دونوں وجودی لحاظ سے اپنی منفرد صلاحیتوں کے مالک ہیں اگر کہیں اس تناظر میں عورت کچھ پہلوؤں سے کمزور نظر آتی ہے تو اس کی وجہ اس کی ساخت یا جنس نہیں بلکہ وہ معاشرتی سوچ اور رویے ہیں جو اسے کمزور کرتے ہیں۔ وہ اگر جسمانی قوت کے لحاظ سے نسبتاً کم ہے تو اس سے یہ مطلب اخذ کر لینا کہ وہ ہر لحاظ سے کمزور یا کمتر ہے، نری سطح بینی اور کج فہمی ہے۔ یہ خود ساختہ سوچ ایک طرف عورت کی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال نہ ہونے کا سبب ہے تو یہی اسے کمزور اور ناتواں بنانے کی وجہ بھی ہے۔

فاطمہ حسن نے اپنی کتاب خاموشی کی آواز عورت کے حق میں متعین رویوں کے لیے مرتب کی ہے۔ وہ تانیثی رویوں کو سامنے لانا چاہتی ہیں۔ اس کتاب میں دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ آٹھ مضامین پر مشتمل ہے جبکہ دوسرا حصہ نو مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں دو مضمون فاطمہ حسن کے ہیں جب کہ باقی مضامین مرتب کردہ ہیں۔ فاطمہ حسن کی مرتب کردہ یہ کتاب ان کے جن مضامین کا احاطہ کرتی ہے وہ مضامین اگرچہ ان کے اپنے نہیں مگر نسائی ادب اور عورت کے شعور کو متعین کرنے میں ان مضامین کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ ان مضامین کی قرات یہ بتاتی ہے کہ فاطمہ حسن نے صرف ان مضامین ہی کو کیوں اپنی کتاب کے لیے منتخب کیا اس لیے کہ یہ مضامین دراصل نسائی تنقید کے نمائندہ کہے جاسکتے ہیں۔ ان مضامین سے فاطمہ حسن کا عورت سے متعلق رویہ سامنے آتا ہے۔

فاطمہ حسن نسائی ادب کی تاریخ متعین کرنا چاہتی ہیں انھیں اس بات کا ادراک ہے کہ عصر حاضر کی عورت کو اپنے شعور سے واقف ہونا چاہیے اور خاص طور پر ادب میں نسائی شعور کی تاریخ فاطمہ حسن کا خاص میدان ہے۔ ان کے نزدیک نسائی ادب، اردو ادب کا قابل قدر حصہ رہا ہے۔ نسائی شعور کی روایت ہمارے ثقافتی رجحان کی ترجمانی کرتی ہے یہ خواتین کے ادراک و شعور کی آئینہ دار ہے نسائی اظہار کا رویہ تاریخ سے جڑا ہوا ہے۔ نسائی ادب و تنقید نہ تو مغرب کی نقالی ہے نہ اس کا کوئی تصادم ہماری اقدار سے ہے۔ یہ ہماری آبادی کے نصف حصے کی ذہنی و فکری سفر کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔

فاطمہ حسن نے اپنے اداریوں میں بھی نسائی شعور کو بیدار کیا ہے۔ ان کی کتاب "بلوچستان کا ادب اور خواتین" ہے جس میں اس کتاب کا مقصد بلوچ سماج میں عورت کے مکمل انسانی روپ کو سامنے لانا ہے سماج میں طبقاتی نسلی اور صنفی سطح پر جو ناانصافی کی جاتی ہے اس کی اصلاح ضروری ہے۔ اس کتاب میں نسائی شعور کا عنصر سامنے آتا ہے سماج نے عورتوں کو جن انسانی حقوق سے محروم رکھا وہ انھیں دیے جاسکتے ہیں سماج میں مثبت تبدیلی بھی لائی جاسکتی ہے بلوچستان کی خواتین بھی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ادب کی بدولت ہی کرتی ہیں جن کو فاطمہ حسن نے اپنی کتاب میں سامنے لایا ہے۔

فاطمہ حسن نے اپنی کتاب "فیمنزم اور ہم" میں عورت کی بطور فرد انفرادی شناخت پر بہت زور دیا ہے ان کی یہ کتاب دراصل فیمنزم کی تعریف نوعیت کو سمجھنے اور معاشرے میں مثبت تبدیلی، خواتین کی موجودہ جدوجہد کو سمجھنے اور ان

کی قدر کرنے کے حوالے سے اہم مضامین شامل ہے ان میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جنہیں ماضی میں بہت سے لوگ فراموش کر چکے ہیں یا نادانستہ مسخ کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ اس کتاب میں اٹھارہ مضامین شامل ہیں۔ جو نسائی ادب کی تاریخ متعین کرتے ہیں۔

فاطمہ حسن نے اس کتاب میں گزشتہ صدی سے عہد حاضر تک اردو ادب میں نسائی شعور کے متعلق مضامین تحریر کیے ہیں جس میں انھوں نے خواتین کی تخلیقی صلاحیتوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس صدی میں خواتین نے جو ادب تخلیق کیا اور اس کا اردو ادب پر جو اثر پڑا اس کو فاطمہ حسن نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ برصغیر کے سماجی نظام میں یہ گنجائش کم تھی کہ خواتین تخلیقی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کر سکیں لیکن ان واقعات کے باعث بھی خواتین نے محنت کے ساتھ جو ادب تخلیق کیا اسے نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ فاطمہ حسن نے نسائیت کے حوالے سے اردو ادب کو فروغ دینے اور روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

فاطمہ حسن نے زاہدہ خاتون شروانیہ کی تخلیقات کو سامنے لا کر بطور عورت ان کی شناخت کرائی۔ زخ ش کی شناخت نہ صرف بحیثیت ایک ادیب کے کروائی بلکہ ان کی پہچان ایک ایسی عورت کے طور پر بھی کروائی جو اپنے عہد کی توانا آواز تھی۔ حالانکہ والد کی نافرمانی کا خوف، پہچان کا خوف، سماج کے رد عمل کی مختلف صورتیں اور کم اندیش جاہل لوگوں سے تحفظ، اور بہت سے دوسرے مسائل کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنا نام بدلتی رہیں۔ حالانکہ وہ صاحب اسلوب شاعرہ تھیں۔ ان کی بطور عورت انفرادی شناخت کا تعین فاطمہ حسن کا بڑا کارنامہ ہے۔ زاہدہ خاتون کو بہ حیثیت ایک انفرادی فرد پیش کرنے کے لیے فاطمہ حسن نے ان کی زندگی کے نمایاں واقعات کو سراہا ہے۔

نسائی شعور اور خواتین کے انفرادی شعور کے متعلق فاطمہ حسن نے اہم کردار ادا کیا اور سماجی کاموں میں پیش پیش رہیں۔ انھوں نے ملازمت وزراعت پیشہ خواتین کے لیے فکری، تحریری طور پر جو کچھ بھی کر سکتی تھیں، کرتی رہی ہیں۔ نسائی ادب کے حوالے سے ان کی کتاب اردو شاعرات اور نسائی شعور سو برس کا سفر (۱۹۲۰-۲۰۲۲) بہت اہم ہے۔ اس کتاب میں فاطمہ حسن نے ایک باشعور عورت، ایک شاعرہ اور اردو ادب کی ایک عالم کی حیثیت سے انھوں نے جس عزم، لگن اور مستقل مزاجی سے کام کیا ہے۔ فاطمہ حسن کی تحریریں نسائی شعور کو اجاگر کرنے میں معاون ہیں اور عصر حاضر کے تناظر میں ان کی تحریریں تانیثیت کا عمدہ نمونہ ہیں۔

اس مقالے کا تیسرا سوال فاطمہ حسن کے عصری شعور سے بحث کرتا ہے۔ فاطمہ حسن نے اپنی تحریروں میں پاکستانی سماج کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی معاصر صورت حال کا تجزیہ بھی بہت عمدہ کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنی شاعری بلکہ اپنی نثر میں بھی بنیادی انسانی حقوق اور معاشرے میں انسانی حقوق کے لیے عملی جدوجہد کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ایک طرف پدری سماج سے بیزاری، خواتین کی سماجی حیثیت کی بحالی، تہذیبی اقدار وروایات کی پاسداری، ملک کے سماجی، سیاسی واقتصادی مسائل کا ادراک نظر آتا ہے تو دوسری طرف کہیں کہیں ان کی تحریروں میں ان مسائل کا حل بھی نظر آتا ہے۔ فاطمہ حسن کے یہاں سماجی صورت حال کی سب سے زیادہ عکاسی ان کے اداریوں میں ہوتی ہے۔۔ ماہنامہ قومی زبان میں لکھے گئے ان کے اداریے معاصر صورت حال کی تصویر کشی کرتے ہیں ۔ان کے اداریوں میں عصر حاضر کے مسائل کی نشان دہی بھی ملتی ہے اور ان کے عہد کے ادب کے مزاج کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ ان میں عصر حاضر کے ادبی وفکری اور معاشی و معاشرتی مسائل کا پورا پورا شعور بھی ملتا ہے۔ فاطمہ حسن نے ملکی و قومی سطح پر جن فکری مسائل کی نشاندہی کی ان میں سب سے بڑا مسئلہ موجودہ دور میں عورت کی حیثیت کا روبہ تنزل ہونا ہے۔ انھوں نے غیر جانب داری سے معاشرے میں عورت کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ اور ان تمام عناصر اور عوامل کو موضوع بحث بنایا جنھوں نے ملکی سطح پر عورت کے کردار کو متاثر کیا۔ اسی حوالے سے ان کا عصری شعور سب سے زیادہ نسائی تحریک سے جڑا نظر آتا ہے۔

فاطمہ حسن کا یہ عصری شعور براہ راست نسائی شعور سے منسلک ہے۔ اس انسلاک کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تحریریں براہ راست عصری صورت حال کی ترجمان بن گئی ہیں وہ کہتی ہیں کہ نسائی شعور کی تاریخ جاننے کے لیے مورخ خواتین کو ڈھونڈا جائے تو بہتر نسائی شعور کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔

موجودہ صورت حال میں پاکستانی معاشرہ جس تفرقہ بازی میں پڑا ہوا ہے فاطمہ حسن اس صورت حال میں مختلف مشاہیر کی زندگیوں کی طرف مراجعت کا درس دیتی ہیں۔ برصغیر کے مسلمان ایک قوم ہیں یہ ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے قوم کو بھی بتایا کہ اخوت، مساوات اور حریت ہمارے مذہب، تہذیب اور تمدن کے بنیادی نقطے ہیں۔ فاطمہ حسن عصر حاضر میں سماجی ترقی کے لیے تعلیم اور تدریس کے پیشے کی طرف مراجعت کا درس دیتی ہیں ان کے خیال میں تعلیم اور تدریس جو کبھی مقدس فریضہ سمجھا جاتا تھا اب اس کا معاشرہ میں جو مقام تھا وہ ہم نے کھو

دیا جو تعلیم سے حاصل ہوتا تھا تعلیم سے معاشرے کا ارتقا ہوتا تھا لیکن اب تعلیم کو کاروبار بنا دیا ہے ہم اس سے پیسہ کما رہے ہیں تعلیم کا مقصد علم کے ذریعے دانش کا حصول تھا وہ دانش صدیوں کی تھی اور پروان چڑھاتے ہوئے آنے والی نسلوں کو منتقل کرنا پڑتی ارتقا کے عمل کو جاری رکھنے والے ذہن تیار کر سکیں تعلیم کی جگہ جہاں الفاظ کی پہچان سے ہوتی تھی وہ اخلاقیات کا سبق ایسا لازمی حصہ تھا جو بچے کے لاشعور میں پھنس جاتا بچپن ہی سے اس طرح ذہن نشین کر دی جاتی ہے یہ نقش کبھی نہیں مٹتا ہر کہانی میں اس وقت میں اخلاقیات کا کوئی پہلو ہوتا تھا اس طرح بچے اخلاقیات پر عمل پیرا ہوتے ہیں جن کی تقلید کرتے تھے۔ یہ کوئی زیادہ پرانی بات نہیں جب سے زیادہ قابل فخر شاگرد استاد کو خوش نصیبی سمجھتے تھے۔ مگر عصر حاضر میں لوگ استاد کو نہ اہمیت دیتے ہیں نہ کتاب کو اہمیت دیتے ہیں جس کی طرف فاطمہ حسن توجہ دلا رہی ہیں۔

فاطمہ حسن کے نزدیک عصری صورت حال میں قومی زبان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ان کے نزدیک زبان ہی وہ بنیادی اکائی ہے جس پر قوم کی شناخت کا دار و مدار ہے۔ انھوں نے اپنے تقریباً اسی فیصد اداریوں میں قومی زبان اردو کی اہمیت کے متعلق ہی بات کی ہے ان کے نزدیک قومی زبان کو تعلیم کی زبان ہونا چاہیے۔ فاطمہ حسن موجودہ تعلیمی نظام کو سخت برا سمجھتی ہیں ان کے نزدیک ہمارا تعلیمی نظام جس میں سرکاری اسکولوں اور کالجوں سے ذہین ترین بچے نکلتے تھے جو اپنی مادری زبان کے ساتھ اردو زبان پر مکمل عبور رکھتے تھے اور اتنی انگریزی سیکھ لیتے تھے کہ قواعد کی غلطی کے بغیر مراسلت کر سکیں اسے تباہ کر کے تجارتی بنیادوں پر تعلیمی ادارے قائم کیے گئے جہاں انگریزی بولنے پر اتنی توجہ دی گئی کہ بچوں کو ان کی اپنی زبان میں گفتگو کی ممانعت ہے۔ اکثر جامعات میں تمام مراسلت انگریزی زبان میں ہوتی ہے۔ اگرچہ رسمی طور پر اردو کو قبول کر لیا گیا ہے اور اب معلوماتی مواد کے تراجم کر دیے گئے ہیں۔ انگریزی کے بڑے بڑے اسکولوں کے مالکان کو دیکھیں تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ اسی طبقے کے افراد ہیں۔ جن کی مراعات کی تاریخ انگریزوں کی داد و دہش سے وابستہ ہے انگریزی زبان کو سیڑھی بنا کر اقتدار اور اعلیٰ عہدوں کے حصول پر قومی زبان و ثقافت کو روندنے والے کھل کر عدلیہ کے فیصلے کے خلاف عمل کر رہے ہیں اور یہ کوئی راز بھی نہیں۔ ان کی سازشوں پر تاریخ میں ایک طویل باب ملتا ہے۔ پاکستان کی قومی زبان اردو کو جو ملک کی اکثریت بول اور سمجھ لیتی ہے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ فاطمہ حسن اردو زبان کو نظر انداز کرنے کی وجوہات پر بھی تفصیلی نظر ڈالتی ہیں اس نظر سے ان کا عصری شعور واضح ہوتا ہے، وہ سماجی عوامل کو مفصل بیان کرنے

عبدالقیوم، حالی کی اردو نثر نگاری،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۸ء۔

فاروقی، محمد احسن،ناول کیا ہے، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۴ء۔

کاظمی،کامران عباس،اردو ناول اور عصریت،لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۲۳ء۔

گوریجہ،رشید احمد،،اردو میں تاریخی ناول،لاہور:ابلاغ،۱۹۹۴ء۔

لطف الرحمٰن،جدیدیت کی جمالیات، بھیونڈی:صائمہ پبلی کیشن،۱۹۹۳۔

مری،شاہ محمد،بے کل شہر میں شانت آتما،کراچی:کتابی سلسلہ پبلی کیشنز۲۰۰۸ء۔

ناگی،انیس،ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری،لاہور:فیروز سنز لمیٹڈ،۱۹۸۸ء۔

نوری،فخر الحق،، نثری نظم،لاہور:مکتبۂ عالیہ،۱۹۸۹ء۔

CENTRAL LIBRARY ISLAMABAD